قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اٹھہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

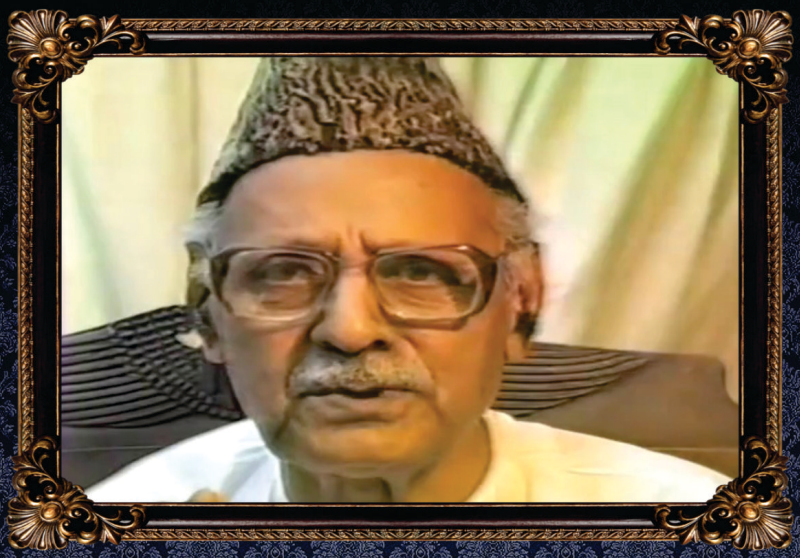
لاہور

فروری 2021ء

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز، معراجِ انسانیت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کی روشنی میں اللہ اور انسان کا تعلق

1- اللہ کی ذات کے متعلق ہم ازخود کچھ نہیں جان سکتے انسان زمان و مکان میں مقید محدود علم کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ لامحدود کے علم رکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ خدا نے اپنی جن صفات کو قرآن میں بیان کیا ہے، ان سے ہم اس کے متعلق اتنا ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔

2- خدا تمام کائنات کا خالق اور اس پر مطلق اختیار رکھتا ہے۔ خدا کی صفاتِ مطلق کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کے پیمانے ان مطلق صفات کے تحت بناتا ہے۔ قرآن نے صفاتِ خداوندی کا ذکر 'الاسماء الحسنیٰ' کہہ کر مزید وضاحت کی ہے۔ حسن صحیح صحیح تناسب (Proportion) کا نام ہے۔ اگر کسی شے کا ذرا سا تناسب بھی بگڑ جائے تو اس کا حسن باقی نہیں رہتا۔ الاسماء الحسنیٰ خدا کی ذات کے مختلف پہلو (Facets) ہیں خدا کی ذات موجود فی الخارج ہے اور چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کے خصائص و صفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔

3- قرآن کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کی وجہ سے صفات و اقدارِ خداوندی کے علم کا حصول اسی قرآنِ کریم کے ذریعے ہی ممکن ہے، جسے قیامت تک کے لئے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی ہدایت جاننے کے لئے کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا اس کی اطاعت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ قرآن کریم میں دیئے گئے اقدار و احکام کی اطاعت کی جائے اس کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر، اس کی دی ہوئی راہنمائی سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستہ کو اختیار کریں۔

4- خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں۔ بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتاً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے، انسانی ذات کی بنیادی صفات خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ:

(الف) انسانی ذات کی یہ صفات محدود، سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

فروری 2021ء

جلد 74 شمارہ نمبر 2

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: تحریک طلوعِ اسلام کا تعارف	ادارہ	4
غلام احمد پرویزؒ (مختصر تعارف)	ادارہ	14
تغیرِ نفس اور خشیۃ اللہ	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	20
بلیک ہول	راجہ عبدالعزیز خان، آزاد کشمیر	28
ذبح ابناءؑ کا قرآنی مفہوم	خواجہ ازہر عباس، کراچی	42
دوقومی نظریہ پاکستان کی اسلامی مملکت۔۔۔۔	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	47

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

59

Surah Al-Najm (النجم) – Durus-al-Qur'an: Chapter 3

By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) Phone: 042-35714546

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: ٠٤٦٥٠٠4073177672

For International Transactions

IBAN:PK36NBPA0465004073177672

Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دل تبریز وکابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز وسازِ زندگی کہ دے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف

(بانیٔ تحریک ؒ کے الفاظ میں)

تقسیم سے قبل گو طلوع اسلام کا مقصد تحریکِ پاکستان کی تائید تھا لیکن اس کی یہ تائید دورِ حاضرہ کی اصطلاح یا مفہوم میں ایک ''سیاسی مقصد'' کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ طلوع اسلام کا مؤقف قرآنی تصور کی ہمنوائی میں یہ تھا کہ اسلام ایک دین (یعنی نظامِ مملکت) کی شکل میں اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اقدار کی حکمرانی ہو۔ اس طرح یہ حصولِ پاکستان کی سیاسی جنگ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو ذہنوں میں جاگزیں کرتا چلا گیا کہ اسلام کا مقصود کیا ہے اور دین کا مطمحِ نگاہ کیا' وہ کس قسم کا ضابطۂ زندگی اور نظامِ حیات پیش کرتا ہے اور وہ ضابطہ یا نظام کس طرح دیگر نظامہائے حیات سے منفرد اور بے مثال ہے۔ وہ کیوں کسی اور ضابطہ سے مفاہمت نہیں کر سکتا اور اس میں کیوں کسی اور نظام کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔

نظامِ خداوندی کو ایک آزاد خطۂ زمین پر مشہود کرنے کی یہی وہ حسین آرزو اور مقدس تمنا تھی جس کو لے کر حصولِ پاکستان کے بعد طلوع اسلام پھر جادہ پیما ہوا۔ اس کے نزدیک حصول مملکت کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ دین کے جن امور کو وہ اب تک اصولی طور پر پیش کرتا چلا آیا ہے ان کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈال کر اس کے نمایاں خط و خال امت کو دکھائے اور قرآن ہی کی روشنی میں اس کے قیام کی موجودہ عملی صورت کا تعین کرے۔ طلوع اسلام کے پیشِ نظر دوسرا کام یہ تھا کہ وہ تمام سلیم قلب' سعید روحیں اور جو قرآنِ کریم کے اس حیات آفریں پیغام سے ہم نوا ہیں لیکن کسی مرکز کے نہ ہونے کے سبب تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے بے خبر اطراف و جوانبِ ملک میں الگ الگ پڑی ہیں اور باوجود ہزار بار سوچنے کے آگے قدم نہیں اٹھا سکتیں کہ وہ اس میدان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہیں انہیں یک دلی اور ہم مشربی کے رشتۂ محکم میں منسلک کر کے ایک ذہنی مرکز پر جمع کر لیا جائے اور اس طرح ان افراد کے اجتماع سے وہ قافلہ مرتب ہو جائے جس کا ہر قدم صحیح منزل کی طرف اٹھے۔

جہاں تک قرآنی نظامِ زندگی کے خط و خال کا تعلق ہے اس کی تفصیل طویل ہے اور اس مختصر وقت میں اسے پیش کرنا دشوار۔ محترم پرویزؔ صاحب نے اس کو وضاحت کے ساتھ رسالہ طلوع اسلام کے ہزارہا صفحات اور بیسیوں کتابوں کی شکل میں نقش کر کے انہیں ملک میں عام کر دیا ہے اور جن کا چرچا آپ چہار اطرافِ عالم میں سنتے ہیں لیکن مختصر طور پر پرویزؔ صاحب

نے جو طلوع اسلام کے مقصد کی وضاحت میں پیش کیا ہے' یہ ہے:

(1) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے۔ خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

(2) قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض (یا نظامِ مملکت) کہتے ہیں۔ قرآن کی رو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

(3) قرآن نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔

(4) رسولؐ اللہ نے سب سے پہلے نظامِ قرآنی قائم کیا اور اپنے رفقائے کار (صحابہ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنھم) کے مشورہ سے قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔

(5) رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا یہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے جاری رکھا جو امورِ ملت کو ملت کے مشورہ سے سرانجام دیتے تھے۔ قرآن کے جن اصولوں کی جزئیات اس سے پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں انہوں نے ان کا تعین کیا جن میں کسی ردوبدل کی ضرورت تھی ان میں ضروری تغیر و تبدل کیا' جن میں ایسی ضرورت نہیں تھی انہیں علیٰ حالہٖ باقی رکھا۔

(6) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا قرآنی نظام باقی نہ رہا' اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا جس میں ہم اس وقت تک مبتلا ہیں۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے اسی انداز کا نظام قائم کیا جائے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائے۔

(7) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا امت کے مختلف فرقے' جزئیات پر جس جس انداز سے عمل پیرا ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل کرے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام کو پہنچتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر پھر سے امت میں وحدت پیدا کرے۔ اس دوران میں اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دین کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور ہم میں جو عقائد و رسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ جو لوگ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ اپنی اصلاح کرتے چلے جائیں۔

(8) قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا نہ قرآن کے بعد خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آ سکتی ہے' نہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی یا رسول۔

(9) قرآن کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ تک مختلف علوم و فنون جس حد تک ترقی کر چکے ہیں وہ سب انسان کے سامنے ہوں اور چونکہ

قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر لاینفک ہے۔

(10) نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرفِ انسانیت کی معراج کبریٰ کی مظہر تھی لیکن بدقسمتی سے ہماری کتب روایات و تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جن سے حضور ﷺ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ آپ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضور ﷺ کی طرف غلط منسوب۔ ضرورت ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے صحنِ چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔

(11) ہم دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں اس لئے ہم کوئی فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے، احکامِ اسلامی کے متعلق البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کی پابندی محض ایک رسم کے طور پر نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کی روح پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے۔

(12) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے اور اس کے بعد کی زندگی میں شرفِ انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

(13) قرآنی نظام میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں جس میں معاشرہ کوئی دخل نہ دے سکے۔ یاد رہے کہ یہ تصور کمیونزم یا سوشلزم کے تصور سے یکسر مختلف ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہ سرمایہ داروں کے لئے خوش آئند ہو سکتا ہے نہ کمیونسٹوں کے لئے۔

یہ تھے دینِ خداوندی کے وہ خط وخال جنہیں طلوع اسلام.....نہایت مستقل مزاجی سے عوام کو دکھاتا رہا اور یہی تھی آہن کی وہ فسان جس سے ریت میں ملے ہوئے فولادی ذرات تڑپ تڑپ کر ریت سے الگ ہو گئے اور کہکشانی ستاروں کی طرح اس حیات آفریں پکار پر کھنچے چلے آئے۔

انہی افراد پر مشتمل تنظیمی ہیئت کا نام ''بزم طلوع اسلام'' ہے۔ ان بزموں کا مقصد اور مشن طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔

قرآنی پیغام کے عام کرنے کے سلسلہ میں ہمارے سامنے یہ حقیقت آئی کہ جب کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو جائے تو وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس موڈ میں ہی نہیں ہوتا کہ پیش آمدہ مسائل پر عقل وبصیرت کی رو

سے غور کرے اور دلائل و براہین کے مطابق کسی فیصلے پر پہنچے۔ افراد کے مجموعے ہی کا نام قوم ہوتا ہے ور جب اقوام بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ جائیں تو یہی چیز ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اس وقت ہماری قوم بھی تباہی کے اسی غار کی طرف رواں دواں چلی جارہی ہے اور بری طرح جذبات کے سیلاب میں بہی جارہی ہے۔ یوں تو مغرب کی خدا فراموش سیاست کی بدولت انتخابات کی وبا ہر جگہ آندھی بن کر اٹھتی اور جھکڑ بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بدقسمتی سے اس نے اور ہی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہاں ایک طبقہ انسان کی طبیعی ضروریاتِ زندگی کے حصول کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہے اور صرف اسی میں انسانیت کے فلاح و بہبود کا راز بتاتا ہے اور اس کے حصول کے لئے وہ اپنی ہر چیز کو داؤں پر لگائے بیٹھا ہے۔ دوسری طرف نظریۂ پاکستان کے مخالفین عوام کے ان جذبات کو مشتعل کرنے میں پوری شدت سے سرگرمِ عمل ہیں جن کا تعلق قلبِ انسان کے نہایت نرم و نازک گوشوں سے ہوتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقاصد کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی اہم ہو جاتی ہے کہ تحریکِ طلوع اسلام دینِ خداوندی کے فروغ اور نظامِ ربوبیت کے قیام و عمل کی پیامبر ہے ان حالات میں ایک طرف مذہب پرست طبقہ ہم سے متقاضی ہے کہ 'دین خطرہ میں ہے۔ اس لئے آپ ہمارے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ کیجئے۔ دوسری طرف سرمایہ داری کے ظلم و استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی خون آشامیوں' عیاریوں اور مکاریوں کا شکار طبقہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم نظامِ ربوبیت کے پیامبر ہو اس لئے سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو دفن کرنے میں ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے۔ تیسری طرف تحریک میں شامل وہ نئے نوجوان ہیں جن کی بے تابیٔ تمنا دبی زبان سے یہ شکوہ کرتی ہے کہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے ہماری موجودہ رفتار نہایت سست ہے۔ اس کے لئے ہمیں باہر نکلنا چاہئے۔ سوشل ورک کر کے ہمیں عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنی چاہئیں اور یوں عوام کی طاقت حاصل کر کے غیر قرآنی نظامِ کہن کی جگہ دینِ خداوندی کا نفاذ کرنا چاہئے۔

اندریں حالات' ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تحریکِ طلوع اسلام کے مقاصد' نصب العین اور اس کے حصول کے لئے طریقِ کار کو مختصر طور پر خود بانیٔ تحریک کے الفاظ میں پیش کر دیں۔

دستور اساسی و اصولی ہدایات برائے بزمہائے طلوع اسلام کی پہلی شق یہ ہے:۔

''بزمِ طلوع اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ' یہ ایک اجتماعی کوشش ہے اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جسے ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں' انہیں الگ کر کے پھر سے اس نظام کی تشکیل کے لئے فضا سازگار بنائی جائے جو عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ میں قائم ہوا تھا۔''

چنانچہ طلوع اسلام کی پہلی کنونشن منعقدہ ۱۹۵۶ء میں محترم پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا:

''اس کے بعد میں اس کے دوسرے گوشے کی طرف آتا ہوں جو اس پہلے گوشے سے بھی زیادہ نازک

اور لطیف ہے۔ لطیف اتنا کہ بعض اوقات اسے صحیح طور پر سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ گوشہ یہ ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور اس کے ذریعے معاشرہ میں انقلاب بغیر گروہ بندی اور پارٹی بازی کے برپا کیا جائے۔ چونکہ دور حاضرہ میں معمول یہ ہے کہ کوئی تحریک بغیر پارٹی بازی کے وجود میں نہیں آتی اس لئے یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ پارٹی بازی کے بغیر بھی کوئی تحریک چل سکتی ہے۔ لیکن برادران! قرآن کریم سے جو کچھ تھوڑی بہت بصیرت میں نے حاصل کی ہے اس کی روشنی میں، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ملت کے اندر تعمیری انقلاب پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ کوئی پارٹی بنائے بغیر ان میں فکری تبدیلی پیدا کرتے جائیں..... قرآن کریم غیر مسلموں کے مقابلہ میں مومنین کو الگ جماعت، ایک جداگانہ امت قرار دیتا ہے لیکن وہ اس امت کے اندر فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے، بعض احباب کہتے ہیں کہ قرآن مذہبی فرقہ کو تو شرک قرار دیتا ہے، سیاسی پارٹی کو شرک نہیں ٹھہراتا، ذرا سوچئے کہ جس اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہی نہیں اس میں مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی میں کیا فرق ہو سکتا ہے؟ لہٰذا مذہبی فرقہ ہو یا سیاسی پارٹی دونوں تفریق فی الدین ہیں۔ پھر کہا یہ جاتا ہے کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اس کے لئے اجتماعی کام کی ضرورت ہے، انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر پارٹی بنانا منع ہے تو یہ اجتماعی کام کس طرح سے ہو سکے گا۔ یہ اجتماعی کام منظم کوشش (Organised Effort) سے ہو سکے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ پارٹی بازی اور منظم کوشش میں کیا فرق ہے؟ اس فرق کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن نے تخرب (پارٹی بازی) کی نفسیات کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جہاں کہا ہے کہ: کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۲)۔ پارٹی کی عمارت تعصب کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور دوسروں سے نفرت کے جذبہ پر استوار ہوتی ہے۔ ہر پارٹی کے ممبر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر کی سعادتیں اور حسنات ان کی پارٹی میں جمع ہیں اور پارٹی سے باہر جتنے لوگ ہیں ان میں کوئی خوبی اور نیکی نہیں۔ اس سے ان کے اندر نخوت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کو سخت ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن انہی ذلیل اور حقیر لوگوں میں سے جب کوئی ان کی پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل بن جاتا ہے۔ پھر اس میں دنیا بھر کی خوبیاں آ جاتی ہیں۔ اگر وہ پارٹی کے ساتھ وفا شعار (Loyal) رہتا ہے تو اس کا ہر عیب ہنر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر اس نے پارٹی سے قطع تعلق کر لیا تو نہ صرف یہ کہ اس کی ہر خوبی عیب بن جاتی ہے بلکہ دنیا بھر کے عیب اسکی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں اور اسے جی بھر کر بدنام کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ پارٹیوں کے ساتھ متمسک رہتے ہیں۔ اپنی پارٹی کی تقویت ہر رکن کا اولین فریضہ ہوتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنا عین جہاد سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں

کی بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، وہ اسے کبھی نہیں سنتے اور اگر کبھی مجبوراً سننا پڑے تو اس کا تمسخر اڑاتے اور استہزاء کی ہنسی ہنستے ہیں۔ ان کی مجلسوں کا محبوب ترین مشغلہ دوسروں کی تذلیل و تحقیر ہوتا ہے، جس میں وہ بڑی لذت لیتے ہیں..... یہ ہیں وہ عناصر جن سے ایک پارٹی ترتیب پاتی اور قائم رہتی ہے۔ لیکن قرآنی نظام کے لئے منظم کوشش کا تصور اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے قرآنی نظام کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور جن کی آرزو یہ ہے کہ یہ نظام پھر سے ملت میں متشکل ہو جائے، وہ سب سے پہلے اس کی بنیادی خصوصیات خود اپنے اندر پیدا کریں اور پھر اس نظام کے تصور کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریات زندگی پوری ہوں اور ان کی مضمر انسانی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما ہوتی جائے۔ اس نظام کے متشکل کرنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیں اور دوسروں کی نشوونما میں اپنی ذات کی بالیدگی اور ارتقاء کا راز سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ جو افراد اس مقصد کے حصول کے لئے منظم کوشش کرنے کے لئے اٹھیں، ان میں پارٹی بازی کی لعنتوں میں سے کسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہوگا۔ وہ دوسروں سے نفرت نہیں، ہمدردی کریں گے۔ وہ ان کی بہبود کا سامان مہیا کرتے پھریں گے۔ وہ اس میں اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز روا نہیں رکھیں گے۔ وہ اپنے کام کی ابتدا بے شک کسی ایک مقام سے کریں گے لیکن پوری نوعِ انسانی ان کی برادری اور ساری دنیا ان کا گھر ہوگی۔ ان کی مساعی، خدا کی صفتِ رب العالمینی کی مظہر ہوں گی۔ اس میں ان کے ذمہ زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانیاں ہوں گی اور دوسروں کے لئے بیش از بیش نفع بخشیاں اور راحت سامانیاں''۔

ایک دوسرے مقام پر پرویزؔ صاحب نے فرمایا:

''قرآنِ کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی ایسے استعمال نہیں کرنے دیتا جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں، اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا''۔

ایک اور مقام پر موصوف نے کہا:

''حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریۂ حیات کی رو سے، انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا لیکن قرآنی نظریۂ زندگی کی رو سے احترام انسانیت، انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ تبدیلی یقین (Conviction) سے آتی ہے اور (Conviction) کی بنیاد دلائل

وبراہین کی رُو سے دل ودماغ کے اطمینان پر ہے۔اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں''۔

''دنیا میں ساری قوتوں کا راز' ایمان میں مضمر ہے۔جس قدر آپ کا یقین محکم ہے اسی قدر نا قابلِ تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں۔شکست وکامرانی کا بنیادی مدار ساز وسامان پر نہیں' یقین اور عدمِ یقین پر ہے۔جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہوگا وہی دنیا میں کامیاب وشادکام ہوں گے۔ یہی شکست وفتح کا اٹل پیمانہ ہے۔اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔جب یقین ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے اور ایمان ہواللہ واحد القہار پر تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہلاسکتی''۔

''(نظام خداوندی) کے قیام کی پہلی منزل شعور کی بیداری ہے۔شعور کی یہ بیداری اور فکر ونظر کی یہ تبدیلی اس نظام کے تصور کے عام کرنے میں اور اس کے درخشندہ اور تابناک نتائج کو نگہ بصیرت کے سامنے لانے سے ہوتی ہے۔اسی کا نام تعلیم کتاب وحکمت ہے۔نبیٔ اکرم ﷺ نے اسی نقطۂ سے آغاز کار کیا تھا.....اس تصور کو عام کرنے سے ایسے' سعادت مند افراد نتھر کر الگ ہو جاتے ہیں جن کی نگاہوں میں کشادگی اور قلب میں وسعت ہوتی ہے۔اسی کا نام نفس کی بالیدگی ہے اور تعلیم وحکمت کے ساتھ اس کا چولی دامن کا تعلق ہے''۔

تعلیم وحکمت کی وضاحت کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے لکھا:

''تعلیم کا تعلق بالعموم انسانی ذہن سے ہوتا ہے اور تزکیہ کا تعلق قلبِ انسانی سے۔کسی حقیقت کو اس انداز سے واضح کر دینا کہ وہ دوسرے کی سمجھ میں آ جائے' تعلیم ہے۔تعلیم سے ذہنی بصیرت تو حاصل ہوسکتی ہے قلبی ایقان نہیں۔دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ذہنی جلا ہی کافی نہیں ہوتی' اس کے لئے قلبی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے جو درحقیقت اعمالِ انسانی کا سرچشمہ ہے' جس سوسائٹی کے نظام کی بنیاد تزکیۂ قلب و تطہیر فکر پر نہیں وہ نظام کبھی نشوارتقاء انسانیت کا کفیل نہیں ہوسکتا۔اس کا نتیجہ ہمیشہ فساد ہوگا۔بہترین دساتیر وقوانین بھی اطمینان بخش نتائج مرتب نہیں کر سکتے جب تک ان قوانین کو نافذ کرنے والی جماعت اور ان پر عمل کرنے والی قوم کے قلب ونگاہ کی اصلاح نہ ہو چکی ہو۔عمل کا محرک جذبہ' قوتِ ارادی ہے اور قوتِ ارادی کا تعلق دل سے ہے' دماغ سے نہیں۔اس لئے تنہا علم عمل کا محرک نہیں ہوسکتا۔قرآن اس قسم کی سوسائٹی تشکیل کرتا ہے جو اطاعتِ احکام میں اپنی ذات کی تسکین محسوس کرے۔قلب کی اس کیفیت کا نام تزکیہ ہے۔جب قرآن قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے تو انسان کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور داخلی دنیا کی اس تبدیلی سے خارجی دنیا میں انقلابِ عظیم آ جاتا ہے۔قرآن یہی انقلاب پیدا کرتا ہے''۔

(موصوف نے کہا)۔''قرآنی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنگامی شورشیں برپا کرنا نہیں سکھاتا۔

وہ اپنی اساس فکری تبدیلی پر رکھتا ہے جسے وہ علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان جذبات کی بھی حسن کارانہ انداز سے پرورش اور تربیت کرتا ہے جو انقلاب کے محرک ہوتے ہیں۔ وہ قلب اور دماغ، عقل اور عشق، جنون اور خرد، ذکر اور فکر، خبر اور نظر، دلائل اور جذبات کے صحیح امتزاج سے داخلی اور خارجی دنیا میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس میں ہر قدم تعمیر کے لئے اٹھتا ہے اور جو چیزیں بظاہر تخریبی نظر آتی ہیں، وہ بھی درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہوتی ہیں۔ ''جنون اور خرد'' جیسے متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر کے انہیں ایک بے پناہ قوت کا امین بنا دینا قرآن کی بنیادی خصوصیت ہے۔۔۔اس قسم کا عقل اور جنون کا امتزاج جس میں نہ تو جنون مذہبی دیوانگی سکھا دے اور نہ ہی عقل اس جنون کی چنگاری کو اپنی خاکستر کے نیچے دبا کر بجھا دے، قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی ہیں وہ اربابِ ''خرد و جنون'' جنہیں وہ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝۱۹۰ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (3:190-191) سے تعبیر کرتا ہے۔یعنی وہ اربابِ عقل وبصیرت جو زندگی کی ہر ساعت اور ہر گوشے میں وحی کی راہنمائی کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور کائنات کی گہرائیوں اور بلندیوں پر بھی غور و فکر کرتے ہیں، یہی ہیں وہ مکمل عدل کا ''خواب'' دیکھنے والے جو اس ''خواب'' کو ایک زندہ حقیقت بنا کر رکھ دینے کے اہل ہوں''۔

طلوع اسلام کی دوسری سالانہ کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے فرمایا:

''جو جماعت قرآنی نظامِ ربوبیت کی تشکیل کا عزم لے کر اٹھتی اور اپنے اللہ سے بیع وشریٰ کا معاملہ کرتی ہے اس کے نفع اور نقصان کے ماپنے کے پیمانے اور اندازے دوسری جماعتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ عام جماعتوں کو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنے ممبر بھرتی کئے۔کس قدر روپیہ فراہم کیا۔ کتنے جلسے کئے، کتنے جلوس نکالے، مخالفین کو دبانے کے لئے کون کون سے حربے استعمال کئے اور اس طرح انتخابات میں کتنی نشستیں حاصل کیں وغیرہ وغیرہ۔لیکن قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔ان کا قلب و دماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ان کی سیرت و کردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ان کی آرزوؤں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں، وہ اپنی ذات، اپنے اعزہ و اقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانینِ خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو، قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں''۔

طلوع اسلام کی ساتویں کنونشن میں موصوف نے کہا:

''انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے' قدیم تصوراتِ حیات اور نظامہائے زندگی کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے' ملوکیت' سرمایہ داری' مذہب' سب ایک ایک کر کے اٹھتے اور مٹتے جا رہے ہیں.....اس وقت لآ کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگر الا اللہ کا تصور اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں اس کے بعد' ان کے مقام سے ہٹانے' یا الا اللہ تک لانے میں نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے اور انسانیت کو کتنا عرصہ اس جہنم میں گزارنا پڑے جس میں وہ صدیوں سے پڑی جھلس رہی ہے''۔

طلوع اسلام کی نویں کنونشن کو خطاب کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے فرمایا:

''یہ ہے عزیزانِ گرامی قدر! مختصر الفاظ میں میری وہ دعوت جسے میں قریب تیس سال سے مسلسل پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ جس دن میں نے اس قرآنی فکر کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا' مجھے اس کا اچھی طرح سے علم تھا کہ اس کی کس قدر مخالفت ہوگی۔ جو شخص لوگوں کے سامنے ان کے مروجہ عقائد اور متوارث نظریات پیش کرتا ہے' پہلے ہی دن ایک انبوہِ کثیر اس کے ساتھ ہوتا ہے' اسے ان کا مسلمہ لیڈر' راہنمائے شریعت یا مرشد طریقت بن جانے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن جو شخص ان کے غلط عقائد اور غیر صحیح اعمال کی تردید کر کے' انہیں ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان کی پامال راہوں سے ہٹا ہوا ہے' وہ دنیا بھر کی مخالفت مول لیتا ہے۔ میری اپنی پہلی زندگی خود انہی پامال راہوں میں گزری تھی اس لئے ایک ہجوم کو اپنے پیچھے لگا لینا' اور ایک بہت بڑی جماعت کھڑی کر کے اسکا قائد بن جانا' میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن میری قرآنی بصیرت کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق بخشی کہ میں ان تمام نگاہ فریب جاذبیتوں اور دامن گیر کششوں سے منہ موڑ کر' قرآن کی آواز پر لبیک کہوں' اور اس طرح دنیا جہان کی مخالفت مول لے لوں' میں نے یہ فیصلہ سب کچھ جانتے بوجھتے' سوچتے سمجھتے کیا اور مجھے کبھی اس پر افسوس نہیں ہوا۔

سوال یہ ہے کہ میں نے مقبولیتِ عامہ کا وہ آسان راستہ چھوڑ کر ان پُرخار وادیوں کو اختیار کیوں کیا۔ اس کا بنیادی جواب تو یہی ہے کہ جب کسی کے سامنے صداقت آ جائے تو خود صداقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسے عام کیا جائے خواہ اس میں کتنی ہی مشقتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ دوسرے یہ کہ تاریخِ اقوام کے مطالعہ سے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اے مذہب تاریکیوں میں پنپتا ہے جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے' مذہب چمگادڑ کی طرح آنکھیں بند کرتا چلا جاتا ہے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے یا ختم ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

یہ تو دین کا خاصا ہے کہ وہ علم کی روشنی میں اور زیادہ چمکتا ہے۔ جیسے کہ میں نے شروع میں کہا ہے ہم بھی

اپنے دین کو مذہب کی سطح پر لے آئے ہیں' اس لئے جب دنیا کے دیگر مذاہب باقی نہ رہے' تو یہ مذہب کیسے باقی رہ سکے گا؟ فطرت کے قانون کے مطابق' ہر وہ نظریہ جو زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا' اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

مذہب کے ختم ہو جانے کے بعد' اگر اس قوم کے سامنے دین نہ ہو' تو وہ دہریت اختیار کر لیتی ہے' اس وقت یورپ کی سیکولر مملکتوں اور کمیونسٹ سلطنتوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ان دونوں میں سیاست' مستقل اقدار سے الگ ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ (علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں) ''چنگیزیت'' کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دہریت کا خاصا یہ ہے کہ وہ خاص اسی قوم کو تباہ نہیں کیا کرتی' اس کا اثر بڑا دوررس ہوتا ہے۔ جب اقتدار کسی ایسی قوم کے ہاتھ آ جائے جو مستقل اقدارِ حیات پر ایمان نہ رکھتی ہو' تو اس سے دنیا جس جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کے شعلے ہم آج ساری دنیا میں مشتعل دیکھ رہے ہیں۔ میری نگہِ بصیرت یہ دیکھ رہی ہے کہ مذہب کے ساتھ جو کچھ یورپ میں ہوا ہے' وہی کچھ اب پاکستان میں ہونے والا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر اس وقت قوم کے سامنے خدا کا دین نہ لایا گیا تو یہاں بھی دہریت چھا جائے گی۔ میری انتہائی آرزو اور کوشش یہ ہے کہ قبل اس کے کہ دہریت کا بڑھتا ہوا سیلاب ادھر کا رخ کرے' یہاں مذہب کو دین سے بدل دیا جائے تاکہ دنیا میں ایک خطہ زمین تو ایسا ہو جو خدا کی پروردگاری کا مظہر بن سکے''۔

طلوعِ اسلام کی دسویں سالانہ کنونشن میں پرویزؔ صاحب نے اراکین بزمہائے طلوعِ اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں نے زمیلانِ گرامی قدر! قرآن کریم کی اس روشنی کو چراغِ راہ بناتے ہوئے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا مقصد' نہایت سکون و خامشی' لیکن انتہائی التزام و استحکام کے ساتھ' قرآنی فکر کو عام کئے جانا ہے۔ اس میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور تماشہ گری کا کوئی دخل نہیں۔ ہمارے دستور اساسی کی ایک شق یہ ہے کہ ہم عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیں گے اس لئے اس تحریک کے ساتھ وابستگی سے نہ تو کوئی سیاسی مفاد عاجلہ حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں نمود و نمائش کی کوئی گنجائش اور شہرت و ناموری کا کوئی مقام ہے۔ یہاں تو دنیا بھر کی مخالفت کو نہایت سکون و اطمینان سے برداشت کرنا' اور لب تک ہلائے بغیر اپنی دھن میں آگے بڑھتے چلے جانا ہے' اس بزمِ شوق میں پروانے کی طرح جل کر مر جانا اور زبان سے اُف تک نہ کرنا ہے' دوسری طرف مفاد عاجلہ کے جہانِ رنگ و بو سے یوں بیگانہ وار گزر جانا ہے کہ اس کی کوئی کشش و جاذبیت آپ کی دامنگیر نہ ہو''۔

یہ ہیں قرآنی حقائق پر استوار اس تنظیم کے مقاصد' اور یہ ہے وہ مخصوص اور متعین طریقِ کار (ذہنی انقلاب اور پھر قلبی انقلاب) جسے اس تحریک نے اپنے روزِ اول سے اختیار کر رکھا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرمالیجئے کہ اس قسم کی تحریک آپ کے تعاون کی مستحق ہے یا نہیں۔ والسلام!

غلام احمد پرویزؒ

(مختصر تعارف)

علامہ اقبالؒ نے دمِ واپسیں فرمایا تھا:

سرُودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

علامہ غلام احمد پرویزؒ (رحمتہ اللہ علیہ) کی ولادت مورخہ 9 جولائی 1903ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی۔ آپ کے دادا' مولوی' چوہدری' رحیم بخش حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک ممتاز بزرگ ہونے کے علاوہ ایک ماہر طبیب اور سنسکرت کے عالم تھے۔ علامہ غلام احمد پرویزؒ کی ابتدائی تربیت اپنے دادا کی زیرنگرانی ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان کی نگاہ کی مشرقی مغربی افقین کافی وسیع اور ''باطنی علوم'' کی گہرائیاں کافی عمیق ہوچکی تھیں۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد سول سروس میں چلے گئے اور 1954ء میں جب کہ آپ وزارتِ داخلہ میں اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تا کہ اپنے قرآنی مشن کو پورا وقت دے سکیں۔

اس دوران میں آپ کی زندگی علمی معرکہ آرائیوں سے عبارت رہی۔ 1932ء میں ابوالکلام آزاد کے تفسیری ترجمہ' ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ انہوں نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کے سلسلے میں اپنے اس نظریہ کی تبلیغ بڑی صراحت سے کی تھی کہ:

> ''عالمگیر سچائیاں دنیا کے ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے تمام مذاہب سچے ہیں لیکن پیروانِ مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی

ازسرِ نو اختیار کرلیں تو میرا کام پورا ہوگیا۔ یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔''

علامہ پرویزؒ کی بصیرتِ قرآنی کے مطابق یہ نظریۂ اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ برہمو سماج کی تعلیم تو ہوسکتی ہے قرآن کی نہیں۔ اس لئے آپ نے اس کی تردید میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا جو ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) (سید سلیمان ندوی کی زیرِ ادارت) کی جنوری 1933ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

اس زمانے میں ابوالکلام آزاد کی شہرت ثابہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت اور وہ بھی ایک ''غیر مولوی'' کی طرف سے کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ لیکن یہ علامہ پرویزؒ کی جرأتِ ایمانی تھی کہ آپ نے سب سے پہلے اس تفسیر پر اپنی تنقید شائع کی۔

1926ء میں ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مسلمان خاتون نے دعویٰ دائر کیا کہ اس کا خاوند قادیانی مسلک اختیار کرنے سے مرتد ہوگیا ہے لہٰذا اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیرِ سماعت رہا اور آخر الامر محمد اکبر صاحب (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے 7 فروری 1935ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ علامہ پرویزؒ کے ایک مضمون ''میکانکی اسلام'' میں ضمناً بیان کردہ نبی کی تعریف کی بنیاد پر سنایا گیا تھا۔ جس کا ذکر فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں وضاحت کے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح قادیانیوں کو پہلی بار کافر قرار دینے کی علمی بنیاد علامہ پرویزؒ کی فراہم کردہ تھی۔ بعد میں آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب ''ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت'' 1974ء میں شائع کی۔

علامہ اقبالؒ کے خاکہ کے مطابق جناب پرویزؒ نے سلسلہ ''معارف القرآن'' کی ابتدا 1928ء میں کی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا۔ ''اللہ'' جو بعد میں ''من و یزداں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ پھر ''ابلیس و آدم'' تحریر کی۔ جس میں آدم۔ ابلیس۔ ملائکہ۔ جن۔ شیطان۔ وحی۔ رسالت وغیرہ عنوانات پر قرآنی تصریحات پیش کی گئیں۔ معارف القرآن کی تیسری جلد ''جوئے نور''۔ چوتھی جلد ''برقِ طور'' اور پانچویں جلد ''شعلۂ مستور'' حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک انبیاء کرامؑ کے حالات زندگی کو محیط ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ بعنوان ''معراجِ انسانیت'' شائع کی۔ وحی کی ضرورت اور اہمیت اجاگر کرنے کے لئے ڈھائی ہزار سال کی فکری کاوشوں کا نچوڑ۔ ''انسان نے کیا سوچا''۔ کے عنوان سے ایک کتاب میں پیش کیا۔ جس کو پڑھنے سے یہ حقیقت ابھر اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ عقلِ انسانی۔ انسانی مسائل کو حل کرنے میں کس طرح ناکام رہی ہے اور پھر یہ بتانے کے لئے کہ وحی کی رو سے انسانی مسائل کا حل کیا ہے۔ آپؒ نے ایک کتاب بعنوان۔ ''اسلام کیا

ہے؟'' شائع کی۔ معاشی مسئلہ ہمارے دور کا اہم ترین مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں معاشی نظریات کی بنیاد پر دنیا دو بڑے بلاکوں میں منقسم تھی۔ اس مسئلہ کے قرآنی حل کو پیش کرنے کے لئے آپ نے متعدد تقاریر کیں اور مضامین شائع کئے جن میں سے کچھ ''خدا اور سرمایہ دار'' نامی کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک مبسوط تصنیف ''نظام ربوبیت'' شائع کی۔

تقدیر کا مسئلہ صدیوں سے الجھا چلا آ رہا ہے۔ اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کے لئے آپؒ نے ''کتاب التقدیر'' تحریر کی۔ آخرت کے متعلق قرآنی توضیحات کو ایک کتاب بعنوان ''جہانِ فردا!'' میں شائع کیا اور اس طرح قریب چالیس سال کی محنتِ شاقہ سے سلسلہ معارف القرآن کو تکمیل تک پہنچایا۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی کتاب فجر الاسلامؔ میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دیگر قوموں کے تصورات کس طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں پر اثر انداز ہوتے گئے اور یوں قرآن کے تصورات کی جگہ غیر قوموں کے تصورات نے لے لی۔ چنانچہ آج جسے مذہبِ اسلام کہا جاتا ہے۔ یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں سے مستعار تصورات کا جن پر لیبل قرآنی اصطلاحات کا لگا دیا گیا ہے۔ ان تصورات سے اور تو اور عربی زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآنِ حکیم کے الفاظ کا کوئی ایسا لغت مرتب کیا جائے جس میں نہ صرف الفاظ کے وہ معنی دیئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے بلکہ ان الفاظ کے پس منظر میں قرآنی تصورات کی بھی وضاحت کی جائے۔۔۔۔ یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا نہ تھا' لیکن اگر انسانوں کی ایسی جمعیّت موجود نہ ہو تو؟ جناب پرویز ہمت ہارنے والے نہ تھے چنانچہ آپ نے چار جلدوں میں ایک ایسا لغت تیار کر دیا جس کی تیاری میں اپنی قرآنی بصیرت کے علاوہ قریب پچاس عربی لغت حوالے کے لئے استعمال کئے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ جناب پرویزؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

> ''اس لغت کے شائع ہونے کے بعد ایک دن ایک عراقی عالم مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ حکومتِ پاکستان کے رابطۂ عوامی کے ایک آفیسر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس نے کہا کہ عراقی علماء کی ایک تنظیم قرآنِ مجید کا لغت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے چاہا ہے کہ جہاں جہاں قرآن کا لغت مدون کرنے کا کام ہوا' یا ہو رہا ہو' ان حضرات سے مل کر اس سلسلہ میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں مجھ سے ملنے آئے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم کون سی ہے جس کے زیر انتظام تمہارے لغت کی تدوین کا کام شروع کیا گیا۔ وہ جماعت کن علماء پر مشتمل تھی' جس نے اس لغت کو مرتب کیا۔ اس کی تکمیل میں کتنا عرصہ لگا۔ اس پر کس قدر خرچ اٹھا۔ اس کی اشاعت کا انتظام کس نے کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کے لئے نہ کوئی تنظیم تھی' نہ جماعت' نہ کوئی مالی ذریعے تھے نہ مادی اسباب۔ یہ سب کچھ میں نے تنہا کیا ہے اور اس کے

ساتھ یہ تمام کتابیں بھی تصنیف اور شائع کی ہیں جو آپ کو ان الماریوں میں نظر آ رہی ہیں۔ وہ صاحب خندۂ زیر لبی سے یہ سب کچھ سنتے رہے۔ میں کسی کام کے لئے گھر کے اندر گیا۔ باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایکا ایکی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت طنزیہ انداز سے علیک سلیک کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ ان کا یہ انداز اور اقدام ایسا ناقابل فہم تھا کہ ان سے اس کی وجہ دریافت کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ کچھ دنوں بعد' رابطۂ عوامی کے اس افسر سے جو ان کے ساتھ آئے تھے سرِ راہ میری ملاقات ہوئی' تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس دن کیا بات ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ اندر گئے ہیں تو ان صاحب نے کہا یہ شخص بالکل غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص تنہا اتنا کام کر لے' سو جب یہ اصلی بات بتانا نہیں چاہتا تو اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہے۔ میں یہ سن کر مسکرایا اور ان سے کہا کہ خیر گذری میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس دوران میں میں نے تیس سال سرکاری ملازمت بھی کی ہے (اس نے اسے بتا دیا تھا)۔''

(طلوع اسلام، دسمبر 1978ء صفحہ:49)

سلسلۂ معارف القرآن اور لغات القرآن کے علاوہ جناب پرویزؒ نے ''مفہوم القرآن'' تین جلدوں میں مرتب کیا۔ قریب ڈھائی ہزار عنوانات کے تحت قرآنی مضامین کو مرتب کر کے ''تبویب القرآن'' شائع کی اور ''مطالب الفرقان'' کے نام سے تفسیر مرتب کر رہے تھے جس کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) اور ''طاہرہ کے نام خطوط'' قرآنی تعلیمات پر مشتمل ادب پارے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اسلامی معاشرت اور پھر قرآن کے بیان کردہ قوانین۔ بعنوان ''قرآنی قوانین'' اور انگریزی زبان میں کتاب۔۔۔۔ (Islam a Challenge to Religion) اس پر مستزاد ہیں۔ غرض کس کس کاوش کا ذکر کیا جائے۔ (تمام تصانیف اور کتابوں کی تفصیل اور تعارف ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ ''جہانِ نو'' میں مل سکتی ہے۔)

ان علمی کارناموں کو سرانجام دینے کے علاوہ آپ نے تحریکِ پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ قائداعظمؒ کے ارشاد کے مطابق دہلی سے ماہنامہ طلوع اسلام جاری کیا جو اپنے پہلے دور میں اپریل 1938ء سے مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے ذریعے آپ نے تحریک پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علماء کے مقابلے میں قلمی جہاد کیا۔ اس دور میں یہ واحد جریدہ تھا جس نے تحریک پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کیا اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریک پاکستان کی صحیح اور مکمل تاریخ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل کے بغیر مرتب نہیں کی جا سکتی۔

قائداعظمؒ پروٹوکول کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ انہیں کوئی شخص پیشگی وقت لئے بغیر نہیں مل سکتا تھا لیکن یہ شرف جناب

پرویزؒ کو حاصل تھا کہ آپؒ کسی بھی وقت قائداعظمؒ سے ملاقات کر سکتے تھے۔ باوجود اتنے قریب ہونے کے جناب پرویزؒ نے کبھی اس بات کو فخریہ بیان نہیں کیا اور نہ ہی پاکستان بن جانے پر کوئی مراعات حاصل کیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد جنوری 1948ء میں آپؒ نے دوبارہ طلوع اسلام شائع کرنا شروع کیا۔ جو باقاعدگی سے تاحال جاری ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے دشمن عناصر بھی یہاں ہجوم کر کے آ گئے اور یہاں آ کر پر پرزے نکالنے لگے۔ اب ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ ان کی مخالفت کے علی الرغم اگر پاکستان بن ہی گیا ہے تو اس میں وہ نظام نہ رائج ہونے دیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ اسلام کی آڑ میں یہاں تھیاکریسی رائج کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ اب دوبارہ جناب پرویزؒ کو ان کے خلاف قلمی جہاد کرنا پڑا۔ قراردادِ مقاصد اور علماء کے بائیس نکات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن پر جناب پرویزؒ نے تفصیلی تنقید کی۔ آپؒ نے تفصیلاً بتایا کہ جسے علماءٔ سنت کہتے ہیں وہ نہ تو متفق علیہ ہے کہ اس کی رو سے کوئی متفق علیہ قانون مرتب کیا جا سکے۔ علماء کا سنت پر اس قدر زور دینا محض اس لئے ہے کہ یہاں قرآنی نظام رائج نہ کیا جا سکے۔ مخالفین سے آپؒ کے پرزور دلائل کا جواب تو بن نہ پڑا۔ انہوں نے آپؒ کے خلاف فتویٰ کفر دے دیا جس پر ایک ہزار ''علماء'' کے دستخط ثبت تھے۔

ضخیم تصانیف کی لمبی فہرست۔ ماہنامہ طلوع اسلام کے ہزارہا صفحات۔ ہفتہ وار درس اور تقاریر کے ٹیپس (Tapes) کا ڈھیر جواب سی ڈی/ ڈی وی ڈی میموری کارڈز کی شکل میں دستیاب ہیں نیز تسوید کے بعد طباعت بھی ہو رہی ہے۔ تحریکِ پاکستان میں' باوجود سرکاری ملازم ہونے کے سرگرم شمولیت' قائداعظمؒ سے قرب حاصل ہونے کے باوجود مراعات حاصل کرنے سے انکار' اپنے خلاف فتوؤں سے بے پروا ہو کر اپنے مشن میں مگن۔ اپنی ہزار سالہ تاریخ کھنگال ڈالئے۔ ہے کوئی ایک بھی ایسا شخص جس نے تنِ تنہا اتنا زیادہ اور اتنا ٹھوس کام کیا ہو؟

5 اکتوبر 1984ء کو آپ نے آخری بار درسِ قرآن دیا اور اس کے بعد مسلسل بستر علالت پر رہے۔ اور 24 فروری 1985ء کو شام چھ بجے آپؒ اس دار فانی سے انتقال فرما گئے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ (55:26-27)

کیونکہ ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

☆.....☆.....☆

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصفٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطّور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(تسلسل میں)

خصوصی درس

تغیرِ نفس اور خشیۃ اللہ

(اس درس کا اکثر و بیشتر حصہ علامہ پرویز مرحوم کی تحریروں پر مشتمل ہے)

سابقہ درس کا موضوع یہ تھا کہ قرآنِ کریم کی آیات (28-35:27) میں نباتات (ثمرات) جمادات (پہاڑوں کے قطعات) اور حیوانی حیات (بشمول انسان) میں نوعی اعتبار سے ایک مختلف فیہ پوزیشن ہے۔ تخلیقِ ربانی کے بعد بڑھنے اور پھلنے پھولنے والی حیات میں ہر نوع اور قسم میں ایک بنیادی خصوصیت ہے جسے اس کی انفرادیت کہا جا سکتا ہے اور یہ انفرادیت اس نوع کے حیاتیاتی سیل میں موجود لونیوں (Chromosomes) پر مبنی ہے جن کی نشاندہی کے لئے قرآنِ کریم نے آیت (35:28) میں اَلۡوَانُہٗ کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے جس میں ہر نوع ''ہٗ'' کے اَلۡوَانٌ (جمع) کا تذکرہ کیا ہے۔

ہر زندہ شئے خلیوں پر مشتمل ہوتی ہے جو جسم میں لاکھوں کروڑوں موجود ہوتے ہیں اور ہر خلیہ کا سائز چند مائکرو ملی میٹر یا اس سے قدرے زیادہ ہوتا ہے۔ انسانی جسم میں ہر سیل (Cell) کے اندر 46 لونئے (کروموسومز) ہوتے ہیں۔ ان لونیوں پر مورثے (Genes) موجود ہوتے ہیں جو ہر نوع کی تخلیق، اس کے قرار اور اس کے کنٹرول کے ذمہ دار ہیں۔ ہر پیدا ہونے والے بچہ کا رنگ، اعضاء، ان کا تناسب اور قد و قامت (دیگر فیچرز) ان جینز (مورثوں) پر مبنی ہوتے ہیں جو انہیں والدین سے ملتے ہیں جو غالب حیثیت (Dominant) اختیار کر جاتے ہیں اور کچھ مورثے پیچھے رہ جاتے ہیں جنہیں Recessive جینز کہا جاتا ہے۔ یہ پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور اس وقت نمایاں ہوتے ہیں جب وہ بطورِ غالب (Dominant) اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

کروموسومز (لونیئے) تو ہر نوع میں مقررہ تعداد ہی میں ہوتے ہیں۔ البتہ موسم، درجہ حرارت، زمینی پس منظر اور خوراک کے اجزاء سے متاثر ہو کر Genes اپنے مختلف افعال ادا کرتے ہیں۔ متحرک زندگی (انسان، حیوان اور دوآبّ) کے علاوہ نباتات میں بھی ماحول، خوراک، موسم اور انسانی عمل دخل (Grafting) وغیرہ سے ان اشیاء اور ثمرات میں رنگوں، ذائقوں اور سائز وغیرہ میں تغیر آتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے 3 آیات (6:114)(13:4)؛(16:13) اور (39:21) میں مختلف اَلۡوَانُہٗ کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے۔ قرآنی راہنمائی کے پیشِ نظر نباتی اور حیوانی مورثوں (Genes) پر ماحول اپنا

اثر ڈالتا ہے جسے مدنظر رکھنا ہوگا اور یہی علماء کی ذمہ داری ہے۔

نباتاتی یا حیوانی زندگی میں چونکہ ہر نوع کے کروموسومز (لونیے) اور ان پر واقع مورثے (Genes) متعین و موجود رہتے ہیں اس لئے اس کی فعالیت (Activity) کا ایک رخ پر اظہار ایک ایسی چیز ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ہر زندہ چیز کی فعالیت اس کی شَاکِلَۃٌ پر منحصر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (17:84)

ترجمہ: فریاد کیجئے کہ ہر ایک اسی حد تک ہی قدم اٹھاتا ہے جہاں تک اس کی شَاکِلَۃٌ اجازت دے۔ اس کا علم تمہارے پروردگار کو ہے کہ ان میں سے کون، زندگی کی سب سے سیدھی راہ پر چل رہا ہے۔''

اس آیت میں ایک لفظ ''شَاکِلَۃٌ'' آیا ہے۔ عربی میں اَلشِّکَالُ اس رسّی کو کہتے ہیں جس سے جانور کی اگلی اور پچھلی ٹانگیں اس طرح باندھ دی جاتی ہیں کہ وہ اس حد تک ہی قدم اٹھا سکے جس حد تک یہ رسّی اجازت دے۔ یہ اسمِ آلہ ہے اس مادہ سے اسم فاعل شَاکِلٌ ہے جس کی مؤنث ''شَاکِلَۃٌ'' ہے یعنی زنجیرِ پا۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ (خود پر منحصر) ہر عمل کرنے والا اسی حد تک ہی قدم اٹھا سکتا ہے جس حد تک اس کی اپنی شاکلۃ (زنجیرِ پا) اجازت دے (کائنات کی ہر چیز میں اس کی ممکنات رکھ دی گئی ہیں اس لئے اس کا ہر عمل اس کی اس شاکلۃ (Inner Destiny) کی تعبیر ہوتا ہے)۔ انسان کی حیوانی سطح کی جبلّت کے مطابق بھی ہر فرد کی ایک شَاکِلَۃٌ ہے۔ یعنی موروثی اثرات، ابتدائی ماحول، تعلیم و تربیت اور جذباتی رجحانات وہ رسیاں ہیں جن سے اس کا پاؤں بندھا جاتا ہے۔) لیکن اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ انسانی تخلیق کے اعتبار سے اس کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ صرف حیوانی جبلّت کی شاکلۃ کا پابند نہیں، اس میں اس کے ''نفس'' کی نشوونما کے وسیع امکانات ہیں۔ تم انسانوں کی ربوبیت کے ذمہ دار (فَرَبُّكُمْ) نے تمہیں اختیار و ارادہ کا حامل ''نفس'' دے کر رسولوں کی معرفت اپنی ہدایتِ وحی سے نوازا ہے کہ اس کے مطابق عمل کر کے ایسے راستہ پر چلو کہ اس سے نشوارتقاء حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ کا نظامِ کائنات، انسانی اعمال کو مانیٹر کر رہا ہے اور اسی کے مطابق' مصافِ زندگی میں اس کا مقام متعین ہوتا ہے اور حیاتِ آخرت میں بھی۔

زیرِ نظر آیتِ کریمہ (17:84) کے فوری بعد کی آیات میں وحیٔ ربانی کی بے مثل قرآنی رہنمائی کا تذکرہ ہے۔ اس امر کو وضاحت سے سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو انسان کی حیاتِ ارضی کی حیثیت:

تخلیقِ ارض و سماء و دیگر کائناتی قوتوں کی فعالیت کے بعد زمین پر نوعِ انسان کی تخلیق ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیگر نوعوں سے مختلف صلاحیتوں سے نوازا اور اسے اپنے علم میں اضافہ کرنے کی خوبی عطا کی۔ اسے نفس عطا کر کے اختیار و ارادہ کی فضیلت عطا کی جسے بروئے کار لا کر یہ اشیائے کائنات کا علم حاصل کر سکتا تھا۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2:31) ''اللہ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھا دئے۔'' اسے زمین پر رہن سہن اور طبیعی زندگی گزارنے کے لئے کہا کہ: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) ''پھر اگر تمہارے پاس میری

طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا، اسے نہ کوئی اندیشہ نہ کچھ غم۔'' زمین پر انسانی آبادی بڑھتی گئی اور قرنہا قرن کے بعد اس کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت، اپنی سکیم کے مطابق حضراتِ انبیائے کرام کی معرفت بھیجتا رہا تا آنکہ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ﴿۲﴾ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۳﴾ (62:2)

مفہوم۔ (جس قسم کا نظام، کائنات میں چل رہا ہے۔ یعنی ہر شے کا قانونِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل رہنا ___ اسی قسم کا نظام انسانی دنیا میں قائم کرنے کے لئے، اس نے آسمانی رشد وہدایت کا سلسلہ جاری کیا)۔ اسی سلسلہ کی آخری کڑی یہ رسولؐ ہے جو ان لوگوں کی طرف آیا ہے جنہیں اس سے پہلے آسمانی کتاب نہیں ملی تھی۔ یہ رسولؐ ان کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کرتا ہے۔ پھر انہیں سمجھاتا ہے کہ ان قوانین کی غرض وغایت کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایسا عملی پروگرام دیتا ہے جس سے ان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ چنانچہ اس رسولؐ کی تبلیغ اور تعلیم وتربیت سے، وہ قوم جو اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھی (زندگی کے صحیح راستے پر گامزن ہوگئی)۔

(اس رسول ﷺ کی رسالت اس کی اوّلین مخاطب قوم تک محدود نہیں) یہ ان کی طرف بھی اسی طرح رسول ہے جو ان کے بعد آنے والے ہیں ___ یعنی عالمگیر انسانیت کی طرف رسول ﷺ، اور موجودہ اور آئندہ تمام نسلوں کے لئے رسول ﷺ۔ (یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے اس قرآن کو ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس رسول ﷺ کا سلسلہ رسالت اس کی امت کی وساطت سے، قرآن کے ذریعے ابد تک باقی رہے گا)۔ یہ سب کچھ خدا کے غلبہ اور حکمت کی بنا پر کہا گیا ہے۔

(مندرجہ بالا آیت (62:2) کے مفہوم کی مزید وضاحت کے لئے آیات 38-2:37، 2:51، 3:164 اور 4:113 کا مطالعہ بھی مفید ہوگا)

اب تک جو بات کہی گئی ہے اس کی رو سے انسانی زندگی اور اس کی خود پر منحصر فعالیت کا انحصار یا تو شَاكِلَتٌ پر ہے یا زندگی کو آگے بڑھانے والے انسانوں کے ربّ کے مطابق اس کی ہدایت پر عمل درکار ہے۔ یہاں دو واضح نظریہ ہائے حیات سامنے آتے ہیں۔

ایک تصورِ حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی محض طبیعی (Physical Life) ہے۔ انسان طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے۔ انہی قوانین کے مطابق اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور انہی قوانین کی رو سے یہ بالآخر مرجاتا ہے۔ عصرِ حاضر کی زبان میں اسے مادی نظریۂ حیات (Materialistic Concept of life) کہتے ہیں۔ اس نظریہ کی رُو سے انسان کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت پڑتی ہے، نہ وحی کو تسلیم کرنے کی حاجت۔ اس نظریہ کے قائل اگر خدا کی ہستی کا اقرار بھی کریں گے تو اس حد تک کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور یہ اس کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے لیکن ظاہر ہے کہ خدا پر اس قسم کے ایمان سے انسانی زندگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم اس قسم کے ایمان کو ایمان تسلیم ہی نہیں

کرتا۔(62-29:61، 31:25، 39:38 وغیرہا) اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ زندگی بس اسی طبیعی زندگی کا نام ہے، موت سے انسان کا خاتمہ ہوجاتا ہے، تو اس کے نزدیک بھی خیر اور شر کا معیار بھی خودساختہ ہوجاتا ہے (وہ صرف شَاکِلَتِہٖ کے تابع ہوجاتا ہے)۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنے جذبات کی تسکین ہوتا ہے اور بس۔ قرآنِ کریم اسے کفر کی زندگی قرار دیتا ہے۔ سورۃ الجاثیہ میں ہے اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ کیا تم نے ایسے شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو اپنے جذبات ہی کو اپنا اِلٰہ بنالیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ۔ وہ قانونِ خداوندی کے مطابق، اپنے علم کے باوجود غلط روشِ زندگی پر چلتا ہے۔ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ اور جذبات پرستی کا طوفان اس کے کان اور دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ فَمَنۡ يَّهۡدِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ (45:23) اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے، مقرر کردہ قانون کے اس حالت تک پہنچ چائے، اس کی صحیح راستے کی طرف، بجز خدا کے قانون کے، اور کون راہنمائی کرسکتا ہے۔ سو کیا تم ایسے شخص کی حالت دیکھ کر نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں وَقَالُوۡا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا نَمُوۡتُ وَنَحۡيَا وَمَا يُهۡلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهۡرُ۔ جو کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم (قوانینِ طبیعی کے مطابق) مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور مرورِ زمانہ (وقت) ہمیں ہلاک کردیتا ہے۔ وَمَا لَهُمۡ بِذٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍ ۚ اِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ (45:24)۔ انہیں حقیقتِ حال کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ یہ محض ظن وقیاس سے کام لیکر اس قسم کا تصور قائم کرلیتے ہیں۔

قرآنِ کریم اس طرح کی زندگی کو حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے:

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَتَمَتَّعُوۡنَ وَيَاۡكُلُوۡنَ كَمَا تَاۡكُلُ الۡاَنۡعَامُ (47:12)

ترجمہ: ''اور جو لوگ (بلند سطحِ زندگی سے) انکار کرتے ہیں، وہ حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سامانِ زیست سے فائدے اٹھاتے (اور پھر مرجاتے) ہیں۔''

اس کے برعکس، دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی نہیں۔ جسم کے علاوہ، انسان میں ایک اور ''شے'' بھی ہے جسے اس کی ذات، یا نفس کہتے ہیں۔ یہ قوانینِ طبیعی کے ماتحت نہیں ہوتی۔ نہ ہی جسم کی موت سے اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس سے انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ اگر اس کی مناسب نشوونما کی جائے تو انسان کی موجودہ زندگی بھی خوش گوار اور سرسبز وشاداب ہوتی ہے اور مرنے کے بعد، وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما ان قوانین کی رُو سے ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے، حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتے ہیں (اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں)۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی ذات پر ''ایمان'' اور خدا، وحی، نبوت اور آخرت پر ایمان کس طرح لازم وملزوم ہیں۔

مادی نظریۂ حیات کی رو سے وہی فرد یا نوع باقی رہتی ہے جو ماحول اور معاملاتِ پیش آمدہ میں اپنا صحیح طبیعی مقام بنا اور محفوظ رکھ سکے۔ اسے وہ Survival of the fitterts یا بقاء اصلح کہتے ہیں لیکن قرآنِ کریم بحوالہ نفسِ انسانی کہتا ہے کہ انسانی دنیا میں بقاء اصلح کے قانون کی بجائے بقاء انفع کا قانون جاری وساری ہے۔ مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ

(13:17) لہٰذا باقی رہنا چاہتے ہو تو وہ کچھ کرو جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو، جس سے ربوبیتِ عامہ ہو جائے۔ اس کی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ، خاص قوم، خاص ملک تک محدود نہ ہو بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوں۔ یہی اسلام کا مقصود اور قرآنی نظامِ ربوبیت کا مطلوب ہے۔

انسانی ذات کی نشوونما میں حارج عوامل وہی ہیں جنہیں جسمانی فقالیت میں ''شَاکِلَتُہٖ'' کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب موروثی اثرات، ابتدائی ماحول، تعلیم وتربیت اور جذباتی رجحانات ومیلانات اور وساوس ہوتے ہیں جو اظہارِ عمل کے لئے آمادگی، اکساہٹ، برانگیختگی، جوش آفرینی اور ہیجان کی بنیاد بنتے ہیں اور بعض اوقات اشتعال اور شدید جذبات کا مظہر بن جاتے ہیں۔ یہی چیزیں انسانی صاحبِ اختیار وارادہ ذات کی نشوونما میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ربوبیت کا اصول یہ ہے کہ ان سب آمادگیوں وساوس اور اشتعال انگیزیوں کو اس کی طرف سے نازل کردہ وحی کے تابع رکھا جائے۔ جہاں ایسے رجحانات وہیجانات وحی کی ہدایت کے خلاف اکسائیں، وہاں ان پر عمل کے بجائے، وحی الٰہی پر عمل کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ شَاکِلَتُہٖ کی ساری اکساہٹیں جبلی تقاضوں اور معاشرتی دباؤ پر بنی ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ جبلی تقاضوں کو ایمان کے زور سے روکیں اور اعمالِ صالحہ سے بدل دیں۔ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجہ میں ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا کہ خدائی ہدایت پر عمل کی راہیں ہموار ہو جائیں گی اور انسان کی موجودہ اور آئندہ نسلیں اصلاح پذیر ہو کر نشوونما ارتقاء حاصل کر سکیں گی۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ
(24:55)

مفہوم: (باقی رہا یہ کہ ان قوانین کی اطاعت سے ملے گا کیا؟ تو) ہم نے ان لوگوں سے جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے (33:27) (اور ان کی حکومت، اس خطۂ ارض کو جنت میں تبدیل کر دے گی 39:74) —— یہ ہمارا ابدی قانون ہے جس کے مطابق ہم نے اقوامِ سابقہ کو بھی اسی قسم کی حکومت (تمکن فی الارض) عطا کی تھی (28:6) —— اسی قانون کے مطابق ہم ان کے ایمان اور اعمال کے نتیجے میں انہیں حکومت عطا کر دیں گے اور ان کے اُس نظامِ زندگی کو مستحکم کر دیں گے۔ جسے ہم نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا خوف، امن سے بدل جائے گا، تاکہ وہ نہایت اطمینان سے، ہمارے، اور صرف ہمارے، قوانین کی اطاعت کریں اور ان پر کسی قسم کا جبر یا دباؤ نہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ کسی اَور کی بھی اطاعت کریں، اور اس طرح شرک کے مرتکب ہوں۔ (دنیا کی کوئی طاقت انہیں مجبور نہ کر سکے کہ وہ قوانین خداوندی کے ساتھ، انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کریں)۔

(لیکن اسے اچھی طرح سن رکھو کہ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا۔ جب تک یہ قوم ہمارے قوانین پر عمل پیرا رہے گی) جو لوگ' ایسا نظام قائم ہو جانے کے بعد' اس سے عملاً انکار کر دیں گے (اور' احکامِ خداوندی کے بجائے' اپنے احکام نافذ کرنے لگ جائیں گے) تو یہ لوگ' اس شاہراہِ حیات کو چھوڑ کر جو انہیں صحیح منزل کی طرف لئے جا رہی تھی' اور راہوں کی طرف نکل جائیں گے۔ (اور اس لئے' اس جنتی معاشرہ کی برکتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ برکات اِیمان وعمل کا نتیجہ تھیں۔ جب اِیمان وعمل نہ رہا تو وہ برکات کیسے باقی رہیں گی؟)۔(24:55)

قرآنی نظامِ حکومت (استخلاف فی الارض) میں معاشرتی انداز کیا ہوگا۔ دیکھئے:

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ (22:41)

مفہوم: (مؤمنوں کی یہ جماعت جو دُنیا سے ظلم اور سرکشی کو مٹانے کے لئے اٹھی ہے) اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی' انہیں اِقتدار حاصل ہو گیا تو (یہ ظلم اور استبداد نہیں کریں گے) یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے (تاکہ تمام افرادِ معاشرہ' قوانین خداوندی کا اِتباع کرتے چلے جائیں)۔ یہ تمام نوعِ اِنسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائیں گے۔ یہ ان احکام کو نافذ کریں گے جنہیں قانونِ خداوندی (قرآن) صحیح تسلیم کرتا ہے اور تمام ایسے کاموں سے روکیں گے جنہیں وہ جائز قرار نہیں دیتا۔ غرضیکہ (یہ ہر پیش آمدہ معاملہ کے متعلق دیکھیں گے کہ اس باب میں خدا کا قانون کیا کہتا ہے۔ اس طرح ان کی حکومت میں' بحث وتمحیص اور باہمی مشاورت کے بعد' آخرالامر) ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا (5:44)۔(22:41)

سابقہ درس میں بتایا گیا تھا کہ لونیوں اور مورثوں کے تعامل میں ماحول، موسم، درجۂ حرارت زمینی پس منظر اور خوراک مداخلت اور تبدیلی (Mutation) کا باعث بنتے ہیں اس لئے قرآنی رہنمائی کے پیشِ نظر نباتی اور حیوانی مورثوں (Genes) پر ان عوامل کی اثر انگیزی پر محتاط رہنا ہوگا اور یہی وہ خشیہ ہے جو علماء کی ذمہ داری ہے۔

انسان ذات اور نفس کے عطیۂ خداوندی سے اگرچہ انسانی شَاکِلَۃٌ میں تبدیلی کی سہولت قرآنی معاشرہ کے قیام میں فراہم ہو جاتی ہے لیکن اس نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر خشیۂ اللہ کا بھی ایک نیا فیلڈ سامنے آتا ہے جس سے علماء کو محتاط رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ وَاخۡشَوۡا یَوۡمًا لَّا یَجۡزِیۡ وَالِدٌ عَنۡ وَّلَدِہٖ ۫ وَلَا مَوۡلُوۡدٌ ہُوَ جَازٍ عَنۡ وَّالِدِہٖ شَیۡئًا ؕ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا ۪ وَلَا یَغُرَّنَّکُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡرُ (31:33)

مفہوم: اے نوعِ اِنسانی! (ایسی روش کبھی اختیار نہ کرو۔ تم) قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور ہمیشہ اپنے

اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت سے ڈرتے رہو جب حالت یہ ہوگی کہ نہ تو باپ' بیٹے کے کسی کام آ سکے گا' اور نہ ہی بیٹا' باپ کا ہاتھ بٹا سکے گا۔ یاد رکھو! خدا کا یہ قانونِ مکافات اٹل ہے۔ اس لئے طبعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد' تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دیں —— دھوکا دینے والے عجیب عجیب طریقوں سے دھوکا دینے کی کوشش کریں گے۔ ان کی چالوں پر کڑی نگاہ رکھنا کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے بہکا نہ دیں۔ (31:33)

یہ بات تھی حیٰوۃ دنیا کی کشش اور شَاکِلَتِہٖ کی اکساہٹ کے مقابل اللہ تعالیٰ کے حیاتِ آخرت میں جنتی زندگی اور انعامات کے وعدے کی جس کا خیال کرتے ہوئے تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ حیاتِ آخرت ایک نئی دنیا ہوگی جسے موجودہ طبعی زندگی کی کیفیات پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس حیاتِ دنیا میں بھی اگر یہ خدائی قوانین کی مخالفت کریں گے تو اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہیں (اور کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہئے) کہ ان لوگوں کی جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں۔ فرمان ہے:

نَحۡنُ خَلَقۡنٰہُمۡ وَشَدَدۡنَاۤ اَسۡرَہُمۡ ۚ وَاِذَا شِئۡنَا بَدَّلۡنَاۤ اَمۡثَالَہُمۡ تَبۡدِیۡلًا

مفہوم: (انہیں اس پر بڑا ناز ہے کہ وہ بڑے صاحبِ قوت اور مضبوط لوگ ہیں لیکن یہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ) ہم ہی نے انہیں پیدا کیا ہے اور ان کے پیکروں کا یہ استحکام اور مضبوطی بھی ہمارا ہی عطا کردہ ہے۔ لہٰذا' اگر یہ ہمارے قوانین کی مخالفت کریں گے' تو ہمارے لئے کچھ بھی مشکل نہیں کہ ہم' اپنے مشیت کے پروگرام کے مطابق' ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں۔ (76:28)

سورہ واقعۃ میں ارشاد ہے:

نَحۡنُ قَدَّرۡنَا بَیۡنَکُمُ الۡمَوۡتَ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ اَمۡثَالَکُمۡ وَنُنۡشِئَکُمۡ فِیۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۱﴾ (56:60-61)

ترجمہ: ''ہم ٹھہرا چکے تم میں مرنا اور ہم عاجز نہیں اس بات سے کہ بدلے میں لے آئیں تمہاری طرح کے لوگ اور اٹھا کھڑا کریں تم کو وہاں جہاں تم نہیں جانتے۔ (یعنی تم کو اور جہاں میں لے جائیں، تمہاری جگہ یہاں اوعر خلقت بسا دیں)۔''

قرآن کریم خدائی قوانین سے روگردانی کرنے والوں کو وارننگ دیتا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ وَیَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿۱۹﴾

(یہ اس لئے کہ اِن کی زندگی کا نقشہ' کائناتی نقشہ کے یکسر خلاف ہے) کائناتی نظام پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہاں ہر شے' تعمیری نتیجہ مرتب کرتی ہے (اور جس چیز میں اس کی صلاحیت نہیں رہتی' وہ ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایسی چیز لے لیتی ہے جس میں اس قسم کی صلاحیت ہوتی ہے)۔ لہٰذا' ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے اعمال تعمیری نتائج پیدا نہیں کریں گے تو تم کائناتی نقشہ میں فٹ نہیں بیٹھ سکو گے' اور خدا کا کائناتی قانون تمہیں نکال باہر پھینکے گا اور تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق لے آئے گا (39:38,9:47، 4:133،7:146)۔

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿٢٠﴾

اور ایسا کرنا خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔(20-14:19)

یوں تو انسانی ذات کی نشوونما کے لئے پورے کے پورے ضابطۂ قرآنی کا اتباع ضروری ہے (اور یہ اتباع قرآنی معاشرہ کا جزو بن کر ہی کیا جاسکتا ہے) لیکن قرآنِ کریم نے اس باب میں ایک بنیادی نقطہ بیان کیا ہے جو بڑا اہم ہے۔ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ خود کھاتا (یا پیتا) ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ میں کھاتا جاؤں اور آپ کے جسم کی پرورش ہوتی جائے۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے ہم دوسروں کی نشوونما کے لئے دیں۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿١٨﴾ (18-92:17)۔ جہنم سے اسے بچایا جاتا ہے جو اپنے مال کو (یا جو کچھ اس کے پاس ہے، اسے) اپنی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ تقویٰ شعار بھی وہی ہوتا ہے جو دیتا ہے۔ ''مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی۔ جو دیتا ہے اور (اس طرح) تقویٰ اختیار کرتا ہے۔(92:5)

یہاں ''خشیہ'' کا ایک اہم پہلو ہے جو انفاق فی سبیل اللہ سے پہلوتہی کے صورت میں سامنے آتا ہے:

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿٣٨﴾ (47:38)

مفہوم: تم میں ایسے لوگ بھی ہیں، کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے، اپنا مال کھلا رکھیں، تو وہ بخل کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جو شخص اس معاملہ میں بخل سے کام لیتا ہے، تو وہ بخل خود اس کی اپنی ذات کے خلاف جاتا ہے۔ اللہ تمہارا محتاج نہیں (کہ تم اسے نہ دو گے تو اس کی ضرورت رکی رہ جائے گی)۔ تم اپنی نشوونما کے لئے اس کے نظام کے محتاج ہو۔ اگر تم اس نظام سے رُوگردانی کرو گے، اور اپنے عہد سے پھر جاؤ گے، تو وہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

سابقہ درس میں مرحلہ زیرِ غور Nature and Nurture کا تھا۔ اس کے بعد کا اگلا مرحلہ تغیرِ نفس ہے (جس کے لئے ایمان اور اعمالِ صالحہ پر مبنی قرآنی نظامِ معاشرہ ضروری ہے) جس کے لئے وحی کو بنیاد بنا کر تعلیم وتزکیہ سے اس کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔ نوعِ انسانی میں اس کے طبیعی جسم کے لئے لونیوں اور مورثوں کے کردار کے تذکرہ میں جس خشیۃ اللہ کی ضرورت تھی، اس کا تذکرہ مثالوں کے ذریعے سابقہ درس میں کیا جاچکا ہے۔ البتہ کے مقابل انسان ذات (نفس) کی نشوونما میں جن مقامات پر خشیۃ اللہ ضروری ہے، اسے آیات (33:31؛ 28:76؛ 61-60:56؛ 20-14:19 اور 47:38 کے حوالہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ فِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ

راجہ عبدالعزیز خان (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قندِ مکرّر

بلیک ہول

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ ایک نسل یا ایک زمانے کا انسان اپنے علمی تجربات ومشاہدات کو اگلی نسل تک منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ صلاحیتیں انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتیں بلکہ خدا کی طرف سے بلا مزد ومعاوضہ ملتی ہیں۔قرآن مجید کے مطابق ابلاغ علم کے دو ذرائع ہیں۔ پہلا تقریر اور دوسرا تحریر۔یعنی اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور قوتِ گویائی عطا کی 55:3-4 اور خدا نے انسان کو تحریر (قلم) کے ذریعے اپنے خیالات کو دُور دُور تک پہنچانے کی استعداد بھی دے رکھی ہے 96:4۔ ''خدا نے انسان میں اس قسم کی صلاحیت رکھ دی ہے کہ جس کی بنا پر اس کے لئے ممکن ہو گیا ہے کہ وہ ان (اشیائے کائنات) کا علم حاصل کر سکے.....لہٰذا علم الاسماء کے معنی ہیں اشیائے کائنات کی ماہیت' کیفیت' خواص اور متمیزات کا علم۔ بالفاظ دیگر علوم طبیعی کی تحصیل کی صلاحیت جس میں علوم سائنس کے تمام گوشے آجاتے ہیں'' 2:31 (مطالب القرآن) اللہ کی عطا کردہ اس صلاحیت کو اجاگر کر کے انسان کائنات کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ انسان کے اس اکتسابی علم کے علاوہ ایک اور علم بھی ہے جو علم وحی کہلاتا ہے۔انسان کو اپنی طبیعی ضروریات کے علاوہ اپنی ذات کی نشوونما کے لئے بھی صحیح راہنمائی کی ضرورت ہے۔ یہ راہنمائی خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرامؑ کو وحی کی صورت میں براہ راست ملتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلہ زریں کی آخری کڑی ہیں جن پر بقول حضرت اقبالؒ نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اس خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم کتاب کو مظہر حمدیت قرار دیا ہے۔یعنی ''جب تم اس ضابطہ قوانین پر غور وفکر کرو گے جسے اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے تو تمہاری زبان سے بے ساختہ اس حقیقت کا اظہار ہو جائے گا کہ فی الواقعہ مستحقِ حمد وستائش ہے وہ ذات جس نے ایسا ضابطہ حیات عطا فرمایا ہے جس میں کسی قسم کا پیچ وخم نہیں۔ وہ کاروان انسانیت کو سیدھی راہ (صراط مستقیم) پر چلا کر اس کی منزل مقصود تک پہنچاتا ہے'' 18:1 ''جس ذات اقدس واعظمؐ نے سب سے پہلے خدا کی حمد کو عام کیا اسے بھی احمدؐ کہہ کر پکارا گیا ہے'' 61:6 (مطالب الفرقان) قرآن اور رسولؐ کے ساتھ مومنین کی ایک صفت حامدون بھی

ہے۔(9:112) خدا کی حمد اس کی تخلیق کردہ کائنات پر غور وفکر کرنے سے ممکن ہے۔ لہٰذا مومنین کا یہ بنیادی فریضہ ہے کہ وہ اشیائے کائنات پر تفکر وتدبر کریں' کائنات کے مختلف گوشوں میں ریسرچ کریں اور ان سے حاصل ہونے والے محسوس نتائج کی نفع بخشیوں کو نوعِ انسانی کے لئے عام کر کے حمد خداوندی کا عملی ثبوت دیں۔ ایسے ہی ارباب فکر ونظر کے لئے اللہ کا فرمان ہے۔ ''یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کی تخلیق میں نیز دن اور رات کی گردش میں صاحبانِ عقل وبصیرت کے لئے حقیقت تک پہنچنے کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ وہ صاحبان عقل وشعور جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے غرض کہ ہر آن قوانین خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں' تخلیق ارض وسماء پر غور وفکر کرتے ہیں اور یوں ریسرچ کرنے کے بعد جب خالق فطرت کی ندرت کاریاں اور نفع بخشیاں ان کے سامنے آتی ہیں تو وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس سلسلہ کائنات کو نہ ہی بے مقصد پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی مقاصد کے لئے''(3:190-93)۔

نبی اکرمؐ کے مبارک ہاتھوں سے لائے ہوئے عظیم انقلاب کی تاریخ کے اہم پہلوؤں کو قرآن کریم نے اپنی لوح محفوظ میں منقوش اور محفوظ کر رکھا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم میں حضورؐ کی سیرت عظمیٰ کے بنیادی گوشوں کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔ انہی گوشوں کے بکھرے ہوئے موتیوں کو چن چن کر علامہ غلام احمد پرویزؒ نے بڑے ذوق اور شوق کے جذبات سے سرشار ہو کر وجد آفریں اور روحانی کیفیت میں ڈوب کر اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''معراجِ انسانیت'' میں آپؐ کی سیرت طیبہ اور آپؐ کے زمانے کے حالات وواقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کا ایک مختصر اقتباس میں اپنے ایک مضمون میں دے چکا ہوں۔ اسی محبت وعقیدت میں ڈوبا ہوا ایک اور اقتباس پڑھئے اور میری طرح روحانی لطف اٹھائیے۔ نبی اکرمؐ کے تذکرہ جلیلہ سے قبل وہ گزشتہ انبیاء کرامؑ کے حالات وواقعات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا چاہتے تھے کیونکہ بقول ان کے ''فاران کی وادی میں پہنچ کر جہاں کا ہر سنگ ریزہ جلوہ فروش صد طور اور ہر ذرہ آئینہ نمائے ہزار سینا ہے' اس کی فرصت نہ مل سکے گی۔ اس لئے کہ وہاں قلب کی ہر حرکت صرف نیاز اور نگاہ کی ہر جنبش وقف سجود ہوگی۔ میقات پر پہنچ کر' ہر زائر حریم مقدس کا ولولہ شوق تیز اور عنان گسیختہ ہو جاتا ہے کہ منزل کا قرب اور عید نظارہ کی کشش اس کے رگ وپے میں بجلیاں بھر دیتی ہے۔ لیکن اس مقام پر میرا یہ عالم ہے کہ ذوق وشوق کی تمام برق آسا بے قراریاں اور جذب وکیف کی والہانہ سرمستیاں یکسر حیرت بن گئیں کہ یہ وہ مقام ہے جہاں کا ہر ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا
(معراج انسانیت)

نسل اِنسانی میں بعض جذبات، خواہشات، تصورات اور معتقدات انسان کے ابتدائی دَور سے متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اِن میں ایک عجوبہ پرستی بھی ہے۔ چنانچہ انبیاءؑ جب اللہ کی طرف سے نازل شدہ وحی کو اس دعوے کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ یہ وحی ان کی یا کسی دوسرے انسان کی فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے 4-53:3 تو محسوسات کا خوگر انسان اس کے لئے ثبوت مانگتا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ اس کی طرح کا ایک انسان جو اسی کی طرح بازاروں میں چلتا پھرتا اور کھانا وغیرہ کھاتا ہے وہ اللہ کا رسول کیسے ہوسکتا ہے 25:7۔ لہٰذا وہ رسولوں سے اس قسم کے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں مرئی اور محسوس نشانیاں (معجزات) مانگتا تھا۔ نبی آخرالزماںؐ کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ کیا گیا۔ وہ اپنے دعاوی کو علم و بصیرت سے پیش کرتے تھے۔ 12:108 اور دلیل و برہان کی رُو سے منوانے کی کوشش کرتے تھے۔ آپؐ ثبوت مانگنے والوں کو کہتے تھے کہ میرے دعاوی کا ثبوت خود قرآن پاک ہے۔ اگر تم غور و فکر سے کام لو اور علم و بصیرت کے تحت گہرے شعور و تدبر سے اس کتاب کا مطالعہ کرو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں اور اس کے تمام دعاوی سچ اور حق پر مبنی ہیں۔ لیکن کورانہ تقلید پرست طبقے کے لئے اتنی محنت و کاوش ممکن ہی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اتنی بڑی ''سردردی'' لینا چاہتے تھے اس لئے وہ آسانی کی خاطر اس کے لئے کوئی محسوس نشانی (معجزہ) طلب کرتے تھے۔ ایسا نشان جو خارق عادت اور فوق الفطرت ہو یعنی ایسا واقعہ جو عقل و فکر کو عاجز کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے خارق عادت معجزے کا ہمیشہ انکار کیا اور فرمایا کہ اگر سب انسانوں کو زبردستی مسلمان بنانا مقصود ہوتا تو میرے لئے ایسا کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ سب کو مومن ہی پیدا کرتا۔ 16:93

معجزات کی طلبی ہمیشہ کفار کی طرف سے کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خارقِ عادت معجزات طلب کرنے والوں کو جاہل قرار دیا ہے۔ 6:35 قرآن کا ارشاد ہے کہ کائنات میں کتنے ہی مخصوص نشانات (معجزات) موجود ہیں جن سے یہ منہ پھیر کر گذر جاتے ہیں (اور ان پر غور و فکر نہیں کرتے۔ 12:105۔ کفار قانون کے مطابق رونما ہونے والے کسی بڑے سے بڑے واقعہ کو معجزہ تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ ایسے واقعات اور مظاہر فطرت کو معجزہ (آیت) قرار دیتے ہیں جو

قانون کے مطابق رونما ہوتے ہیں یا قانون کی پیروی کرتے ہیں۔ مثلاً زمین و آسمان کی تخلیق میں، رات اور دن کی گردش میں، سمندر میں چلنے والے جہازوں میں، بارش کے پانی میں، اس پانی سے مردہ زمین کو قابل کاشت بنانے میں، زمین پر جانداروں کو آباد کرنے میں اور ہواؤں کی مختلف سمتوں میں تبدیلی پر نیز فضا میں بادلوں کو مسخر کرنے میں اہل علم و عقل کے لئے معجزات اور نشانیاں ہیں۔ 2:164

گذشتہ صدی میں بلیک ہول (Black Hole) کی دریافت بھی اللہ کی انہی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ یہ ایک ایسا مظہر ہے جو دیکھائی نہیں دیتا لیکن اس سے متعلقہ اکثر قوانین کا ادراک ہو چکا ہے۔ اسٹیفن کے مطابق ''سائنس کی تاریخ میں بلیک ہول جیسی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ جن میں کسی نظریئے کی درستی کا مشاہدہ ثبوت ملنے سے پہلے، اس کا ریاضیاتی ماڈل اتنی تفصیل سے تیار کیا گیا ہو اور یہی بلیک ہول کے مخالفین کا مرکزی اعتراض بھی تھا کہ ایسے اجسام کا کیسے اعتبار کر لیا جائے جن کا واحد ثبوت اعداد و شمار ہوں اور وہ بھی اضافیت کے مشکوک عمومی نظریے کی بنیاد پر نکالے گئے ہوں''۔ وہ مزید کہتے ہیں۔ "Athough Beckenstain's hypothesis that black holes have a finite entropy regaires for its consistency that black holes should radiate thermally, at first it seems a complete miracle" ایک بھارتی نژاد امریکن ماہر طبیعات رامیش نارائن بلیک ہول کو معجزہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

That is the miracle of a black hole, if you can measure its mass and spin, you, have a sense, obtained the complete story".

ایک اور امریکن ماہر فلکیات 'Steve Nadis' بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"Black hole's extreme gravity takes us to the very limits of physics and bout as far from every day experience as we can get. At its central singularity, density and curuature race toward infinity, space and time come undone, and the tools of conventional physics are useless."

بلیک ہول کی اصطلاح خاصی نئی ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ تفصیل بتاتے ہیں۔۔

"The Term black hole is of very recent origin. It was coined in 1969 by the American scientist John weeler as a graphic discription of an idea that goes back at least two hundred years, to a time where there were two theories about light. One, which Newton favoured, was that it was composed of particle; the other was that it was made of waves. We now know that both theories are correct. By the wave/particle duality of Quantum mechanics, light can be regarded both a wave and particle.

اس تمہید کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ''اس وقت تک یہ بات واضح نہیں تھی کہ اگر روشنی پارٹیکل پر مشتمل ہے تو یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ پارٹیکل بھی گریوٹی سے اسی طرح متاثر ہوں گے جیسے توپ کے گولے' راکٹ یا سیارے متاثر ہوتے ہیں۔ شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ روشنی کے پارٹیکلز لامتناہی (Infinitely) تیزی سے سفر کرتے ہیں اس لئے گریوٹی انہیں آہستہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ مگر روئمر (Roemer) کی دریافت کہ روشنی محدود رفتار سے سفر کرتی ہے' کا مطلب تھا کہ گریوٹی اس پر اہم اثر ڈال سکتی ہے۔ اسی مفروضے پر کیمبرج کے ڈان جان مچل نے 1783ء میں لندن کی رائل سوسائٹی کے میگزین فلاسیفیکل ٹرانسیکشن میں ایک مقالہ لکھا تھا' جس میں اس نے کہا تھا کہ ایک ستارہ جو بہت بڑی کمیت (Mass) رکھتا ہو اور ٹھوس ہو' گریوٹی کے اتنے طاقتور میدان (Strong gravitational Field) کا حامل ہوگا کہ روشنی فرار نہ ہو سکے گی۔ اور ستارے کی سطح سے خارج ہونے والی روشنی کو زیادہ دور جانے سے پہلے ستارے کی گریوٹی واپس کھینچ لے گی۔ مچل نے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ اس طرح کے ستارے بڑی تعداد میں ہو سکتے ہیں لیکن ہم انہیں دیکھ نہیں سکیں گے کیونکہ ان کی روشنی ہم تک نہیں پہنچے گی۔ مگر ہم ان کی گریوٹی کی کشش کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی اجسام کو اب ہم بلیک ہولز کہتے ہیں یعنی "Such objects are what we now call black holes, because that is what they are black voids in space.

یعنی خلا میں تاریک خلا۔

ایک فرانسیسی سائنسدان M-de-Lapalace نے بھی مچل سے الگ اسی طرح کا ایک نظریہ پیش کیا تھا لیکن بعد میں

اس نے اسے ایک احمقانہ خیال سمجھ کر ترک کر دیا تھا۔ روشنی کے پارٹیکل ہونے کا نظریہ بھی انیسویں صدی میں غیر مقبول ہو گیا تھا۔ اس وقت یہ واضح نہیں تھا کہ روشنی گریوٹی سے متاثر ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔ اس کی وضاحت بعد میں یوں کی گئی کہ نیوٹن کے نظریہ گریوٹی میں روشنی کو توپ کے گولوں کی طرح سمجھنا مناسب نہیں۔ کیونکہ روشنی کی رفتار مقرر ہے۔ زمین سے اوپر کی طرف جانے والا گولہ گریوٹی کے اثر سے سُست پڑ جائے گا اور آخر کار رُک کر نیچے گرنے لگے گا۔ لیکن ایک فوٹان (Foton) مقررہ رفتار سے اوپر اٹھتا رہے گا۔ یوں نیوٹن کی گریوٹی روشنی کو متاثر نہیں کر سکے گی۔ گریوٹی کے روشنی پر اثر کا مناسب نظریہ اس وقت ملا، جب 1915ء میں آئن سٹائن نے عمومی نظریہ اضافیت نظریہ پیش کیا کہ کائنات میں روشنی کی رفتار (تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ) سے زیادہ کوئی چیز بھی سفر نہیں کر سکتی۔

بلیک ہول کس طرح تشکیل پاتا ہے۔ ان کے مطابق۔

"A star is formed when a large amount of gas (mostly hydrogen) starts to collapse in on itself due to its gravitational attraction. As it contracts the atoms of gas collide with each other more and more frequently and greater and greater speeds - The gas heats up. Eventually the gas will be so hot that when the hydregen atoms collide they no longer bounce off each other, instead coalesce to form helium. The heat released in this reaction, which is like a controlled hydrogen bomle explosion. That makes the star shine. This aditional heat also increses the pressure of the gas untill it is sufficient to balance its gravitational attraction, and the gas stops contracting."

اس بارے میں وہ مزید کہتے ہیں کہ یہ ایک غبارے کی طرح ہے جس کو پھیلانے والے اندرونی ہوا کے دباؤ اور پھیلنے والے ربڑ کے تناؤ میں ایک توازن ہے جو غبارے کو چھوٹا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ستارے ایک طویل عرصے تک اسی طرح برقرار رہیں گے۔ نیوکلیئر ردعمل سے نکلنے والی حرارت گریوٹیشنل کشش کے ساتھ توازن قائم کرتی رہے گی۔ لیکن ایک

وقت آئے گا جب

"Eventually, however, the star will run out of its hydrogen and other nuclear fuels, paradoxically, the more fuel a star starts off with, the sooner it runs out"

ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ستارہ جتنا ضخیم (Massive) ہوگا گریوٹی سے توازن پیدا کرنے کے لئے اسے اتنا ہی گرم ہونا پڑے گا اور جتنا یہ گرم ہوگا اتنی ہی تیزی سے یہ اپنا ایندھن استعمال کرے گا۔ شاید ہمارے سورج کے پاس مزید پانچ ارب سال کے لئے ایندھن موجود ہے لیکن زیادہ کمیت والے ستارے اپنا ایندھن دس کروڑ سال میں خرچ کر سکتے ہیں۔

جب کوئی ستارہ ایندھن کی کمی کا شکار ہوتا ہے تو وہ ٹھنڈا ہو کر سکڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اسٹیفن کے مطابق اس کا علم 1920ء کے عشرے کے اواخر میں ہی ہو سکا۔ وہ ایسے کہ 1928ء میں ایک بھارتی نژاد ماہر فلکیات چندر شیکھر (یہ سر آرتھر ایڈنگٹن کا شاگرد تھا) نے حساب لگایا کہ ایک ستارہ اتنا بڑا ہونے اور اپنا ایندھن استعمال کر چکنے کے بعد بھی خود اپنی گریوٹی کے خلاف خود کو کیسے برقرار رکھ سکتا ہے۔ چندر شیکھر کو یہ اندازہ ہوا کہ قوت گریز (Repulsion) کی بھی ایک حد ہے جو اصولِ اِستثنیٰ فراہم کرتا ہے۔ اضافیت کے نظریئے کے مطابق یہ ستارے میں مادی پارٹیکل کی رفتار کو روشنی کی رفتار تک محدود کر دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ جب ستارہ خاصا کثیف ہو جاتا ہے تو اصولِ استثنیٰ کے باعث قوت گریز قوت تجاذب (Gravity) سے کم ہو جاتی ہے۔ چندر شیکھر نے یہ بھی حساب لگایا کہ سورج سے ڈیڑھ گنا کمیت والا ٹھنڈا ستارہ اپنی گریوٹی کی کشش کے خلاف خود کو سہارا دینے کے قابل نہیں ہوگا۔ اس کمیت کو اب چندر شیکھر کی حد (Chandar shakhar limit) کہتے ہیں۔ شیکھر کو بعد میں نوبل پرائز بھی ملا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بلیک ہول کے تصور پر ابتدائی تحقیق کرنے والے چندر شیکھر اور بگ بینگ پر ابتدائی کام کرنے والے بلجیم کے لیماٹائر دونوں سر آرتھر ایڈنگٹن کے شاگرد تھے۔ لیکن ایڈنگٹن نے اپنے دونوں شاگردوں کے نظریات سے اتفاق نہیں کیا بلکہ اختلاف کیا تھا۔

اگر کوئی شخص توپ کا گولہ فائر کرے تو کچھ وقت کے بعد گولے کی رفتار کم ہو جائے گی اور وہ کشش ثقل کے باعث واپس زمین پر گر جائے گا۔ تاہم اگر بلندی کی طرف جانے والی شے کی ابتدائی رفتار ایک خاص ولاسٹی سے زیادہ ہو تو کشش ثقل اس کو نہیں روک سکے گی۔ اور یہ اس سے باہر نکل جائے گی۔ 'Escape valocity' کی حد زمین سے بارہ کلومیٹر اور سورج

سے 619 کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔ روشنی کی رفتار چونکہ بہت زیادہ ہے اس لئے روشنی کو زمین یا سورج سے نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن مچل نے یہ دلیل دی ہے کہ کائنات میں ایسے بڑے اجسام بھی ہو سکتے ہیں جو ہمارے سورج سے زیادہ کمیت والے ہوں اور ان کی کثافت (Density) اور گریوٹی escape valocity سے زیادہ ہو تو وہاں سے روشنی باہر نہیں آ سکے گی۔ اس لئے ہم اُن کو نہیں دیکھ سکتے۔ مچل نے ایسے ستاروں کو (Black Star) کہا ہے۔ یہی وہ سیاہ ستارے ہیں جنہیں آج کل بلیک ہول کہا جاتا ہے۔

اسٹیفن نے اس کی مزید تشریح یوں کی ہے

"When the star had exhausted its nuclear fuel, there would nothing to maintain the outward pressure, and the star would begin to collapce of its own gravity; As the star shrinks the gravitational field at the surface would become stronge and the escape volicity would increas. By the time the raduis had got down to 30 kilometres, the escape valocity would have increased to 3000,000 kilometres per second, The valocity of light, after that time any light emited from star would not be able to escape infinity that would be dragged back by the gravdational field. The result would be a black hole; a region of space time from which it is not possible to escape to infinity."

یہ ہے بلیک ہول کی پیدائش کا مختصر احوال۔ ان بلیک ہولز کی طرح بہت چھوٹے چھوٹے بلیک ہولز بھی ہیں۔ لیکن ان کے وجود میں آنے کا طریقہ کار مختلف ہے۔ بقول سٹیفن:۔

"There might also be quite a number of very much smaller black holes scattered arround the universe, formed not by collapse of stars but by the collapse of light / comperessed region in the hot, dense meduim

that is belieced to have existed shortly after the big bang in which the universe originated.

بلیک ہول کی پہچان کی صرف تین نشانیاں ہیں وہ یہ کہ:۔

When a black hole is created by gravitational collapse, it rapidly settles down a stationary state that is characterized by only three parameters; The mass, The angular momentum and the electric charge.:"

اسٹیفن کے مطابق ''بلیک ہول کے بال نہیں ہوتے'' کا مطلب ہے کہ اس کے بارے میں بہت ساری معلومات گریویٹیشنل Collasre میں ضائع ہوجاتی ہیں اور ہمارے لئے بہت ہی کم معلومات بچتی ہیں۔ جہاں تک بلیک ہول کی تلاشی کا تعلق ہے تو اس کی مثال یوں ہے

"To detect a black hole as by its very definition it does not emit any light. It might seema lit like looking like a black cat in a coal cellar."

تاہم کچھ مزید تحقیقات کے بعد اسٹیفن کا کہنا ہے کہ ہم بلیک ہول کو دیکھ تو نہیں سکتے لیکن اس کی موجودگی کا احساس ضرور کر سکتے ہیں۔ کیونکہ عمومی اضافیت کے نظریے کی پیش گوئی کے مطابق حرکت کرنے والے بھاری اجسام گریویٹیشنل لہروں کے اخراج کا باعث بنتے ہیں۔ جو مکان (Space) کے خم میں روشنی کی رفتار سے سفر کرنے والی لہریں ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک اور تحقیق کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بلیک ہول میں پارٹیکل بنتے بھی ہیں اور خارج بھی ہوتے ہیں۔ وہ یوں

"When i was investigating what the behavior of matter in the vicinity of black hole would be according to quantum mechanics. To, my great surprise, I found that black hole seemed to emit particle at a steady rate."

آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ اس وقت سب لوگوں کی طرح میرا بھی یہی خیال تھا کہ بلیک ہول سے کوئی شے بھی خارج نہیں ہوتی اس لئے میں نے اس تصور سے جان چھڑانے کی بڑی کوشش کی لیکن آخر کار مجھے اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس کا

طریقہ کار وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

"Quantum machanics therefor, allows a particle to escape from inside a black hole, same thing that is not allowed in classical mechanics.

یہ 1977ء کی بات ہے جب ان کا خیال تھا کہ پارٹیکلز بلیک ہول کے اندر سے فرار ہوتے ہیں۔لیکن 1988ء میں جب انہوں نے اپنی کتاب ''بریف ہسٹری آف ٹائم'' شائع کی تو وہ مزید تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ پارٹیکل بلیک ہول کے اندر سے نہیں بلکہ باہر سے فرار ہوتے ہیں۔

"Quantum theory tells us, that the particles do not come from with in the black hole, but from the "empty" space just outside the black hole's event horizon."

آگے چل کر وہ خالی جگہ "Empty" کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جسے ہم خالی جگہ سمجھتے ہیں وہ مکمل طور پر خالی نہیں ہوسکتی۔مطلب یہ کہ گریویٹیشنل اور برقی مقناطیسی میدانوں جیسے تمام میدان بالکل صفر (Zero) نہیں ہوسکتے۔اس لئے خالی جگہ میں کسی میدان کو صفر پر متعین بھی نہیں کیا جاسکتا۔اس کی تفصیل میں وہ پارٹیکل اور انٹی پارٹیکل کی تفصیلات کو شامل کر کے ایک طویل بحث کرتے ہیں جو ایک الگ موضوع ہے۔بلیک ہول کی موجودگی کی پہچان روشنی کے ترچھا ہو جانے سے بھی ممکن ہے۔روشنی صراط مستقیم میں سفر کرتی ہے لیکن اگر اس کے راستے میں کوئی ستارہ وغیرہ آ جائے تو بقول سٹیفن۔

"Light from a star passing near the sun is deflected by the way the mass of the sun curves spac-time. This produces a slight shift in the apparent position of the star as seen from the earth. This can be observed during an eclipse."

اوپر 'Event horizon' (واقعاتی افق) کی اصطلاح کا ذکر آیا ہے۔واقعاتی افق۔زمان و مکان کے خطے میں ایک ایسی حد ہے جہاں سے فرار ہونا ممکن نہیں ہے یہ بلیک ہول کے گرد ایک جھلی (membrane) کے طور پر کام کرتی ہے۔ واقعاتی افق کے ذریعے کوئی چیز بلیک ہول میں گر تو سکتی ہے مگر اس کے ذریعے کوئی چیز بلیک ہول سے باہر نہیں آ سکتی۔ یہ

بلیک ہول کی سرحد ہے۔ سٹیفن کے مطابق

"It means that the boundry of black hole the event horizan, is formed by the paths in space - time of rays of light that just fail to get away from the black hole, hovering forever just on the edge."

اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ بلیک ہولز اتنے تاریک بھی نہیں ہیں۔ ان کے الفاظ میں:۔

"In 1973 I started investigating what difference the uncertainity principle would make to black hole. To my great surprise and that of everyone else, i found that it meant that black holes are not completely black."

بلیک ہول میں گرنے والی کوئی چیز یا ہر شخص بہت جلد لامتناہی کثافت اور وقت کے اختتام تک پہنچ جائے گا۔ واقعاتی افق کے لئے وہ جملہ کہا جاسکتا ہے جو مشہور شاعر ''دانتے'' (Dante) نے دوزخ میں داخلے کے لئے کہا تھا۔

"All hope aban don, ye who enter here."

ایک اور اصطلاح برہنہ واحدانیت (Naked singularity) کی بھی بلیک ہولز کی بحث میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بلیک ہول بنتے وقت اس کے اندر ہر چیز خلا نورد سمیت ڈھیر ہو جائے گی اور اس کے لئے وقت کا اختتام ہو جائے گا۔ تاہم بلیک ہول سے باہر مشاہدہ کرنے والے پر اس ناکامی کا اثر نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس اکائیت سے کوئی اشارہ یا روشنی اس تک نہیں پہنچ پائے گی۔ اس حقیقت کی روشنی میں پین روز نے کونیاتی سنسرشپ کا مفروضہ (Cosmic consorhip hypothesis) پیش کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں جو اکائیت گریویٹیشنل زوال سے پیدا ہوتی ہے اس کا وقوع پذیر ہونا' بلیک ہول جیسی جگہوں پر ہی ممکن ہے اس کو یوں بیان کیا جاتا ہے۔

''خدا برہنہ اکائیت سے نفرت کرتا ہے'' "God abhors Naked Singularity"

ابتدا میں آئن سٹائن اور ایڈنگٹن جیسے بڑے بڑے سائنسدانوں نے بلیک ہول کے نظریے کی سخت مخالفت کی تھی۔ آئن سٹائن نے خود لکھا کہ ستارے کا زیرو سائز تک سکڑنا ممکن ہی نہیں۔ ایڈنگٹن نے اپنے ہونہار شاگرد کو تلقین کی کہ یہاں اس واہیات کام میں اپنا دماغ مت کھپاؤ اور نظام فلکیات کے دوسرے مسائل پر کام کرو۔ 1920ء میں جب ایک اخباری نامہ

نگار نے سر ایڈنگٹن کو بتایا کہ ''عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ نظریۂ اضافیت کو پوری دنیا میں صرف تین آدمی سمجھتے ہیں'' تو انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا کہ مجھے یہ سوچنے کے لئے وقت چاہئے کہ وہ تیسرا آدمی کون ہے؟'' بلیک ہول کے نظریئے کی مخالفت میں ابھی تقریباً ایک عشرہ قبل کیلیفورنیا کے ایک سائنسدان جارج چپلن نے دعویٰ کیا تھا کہ بلیک ہول کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ جنہیں بلیک ہول کہا جاتا ہے وہ دراصل تاریک توانائی (Dark Energy) یا انتہائی کثیف تاریک مادے سے بنے اجرام فلکی ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ واقعاتی افق پر مادے/توانائی کا عجیب وغریب طرز عمل ایک طرح کے کوانٹم ہیئتی انتقال (Quantum phase transitan) کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کے مطابق نظریۂ اضافیت اور کوانٹم اصول کے درمیان ایک اہم فرق وقت کی حیثیت کا ہے۔ نظریہ اضافیت میں ''مطلق وقت'' کا کوئی تصور نہیں لیکن اگر کوانٹم اصول میں ''مطلق وقت'' کی حیثیت ختم کردی جائے تو یہ اصول زمین بوس ہوجائے گا۔

اسٹیفن کے مطابق یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ بلیک ہولز بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ ان کی تعداد نظر آنے والے ستاروں سے کہیں زیادہ ہوسکتی ہے۔ ہماری کہکشاں کے مرکز میں ایک بہت بڑا بلیک ہول ہے جس کی کمیت ہمارے سورج سے ایک لاکھ گنا زیادہ ہے اس کے علاوہ کواسارز (Quasars) جیسی تابناک کہکشاؤں کے مرکز میں سورج کی کمیت سے کروڑوں گنا زیادہ بڑے بلیک ہولز ہو سکتے ہیں۔ اگر چندر شیکھر کی حد سے کم کمیت والا ستارہ ڈھیر ہوجائے تو یہ سفید بونا (White Dwarf) کہلاتا ہے۔ 1967ء میں پلسار (Palsar) نام کے اجسام دریافت ہوئے جو درحقیقت گردش کرنے والے نیوٹرون ستارے ہیں۔

بلیک ہول کے اندر یا باہر سے نکلنے والا مادہ اور Radiation اس کی کمیت کو کم کرتے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں بقول اسٹیفن۔ "This will cause the black hole to get smaller and to send out particles more rapidly. Eventually, it will get down to zero mass and will disappear completely."

بلیک ہول کے خاتمے کے بعد ان اجسام کا کیا بنتا ہے جو اس میں موجود تھے؟ اسٹیفن کے مطابق ان سے چھوٹی چھوٹی مزید کائناتیں وجود میں آتی ہیں۔ تفصیل دیکھئے۔

"What will happen then to the objects, including possible space ships,

that have fallen into the black hole? According to same recent work of mine, the answer is that they will go off into a little unuverse of their own. A small, self contained universe branches off from our region of the universe. This baby universe may join on again to our region of space - time, If it does, it would appear to us to be another black hole that formed and then evaporated."

اسٹیفن کے نزدیک اس طرح بلیک ہول کے ذریعے خلاٗ میں سفر کرنا بھی ممکن ہے۔ دیکھئے کس طرح:۔

"Particles that fell into one black hole would appear as particles emitted by the other black hole and vice versa. This sounds like just what is required to space travel through black holes.

لیکن اسٹیفن کے نزدیک حقیقی وقت میں ایسے واقعات کا رونما ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ حقیقی وقت میں بلیک ہول کے اندر گرنے والے کے لئے وقت کا اختتام ہو جائے گا۔ لہٰذا (ایسا ہونا صرف فرضی وقت (Imaginary Time) میں ہی ممکن ہے۔ اس لئے: "The motto for any one who falls into a black hole must be:

'Think imaginary."

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ کائنات میں اگر مرئی اور غیر مرئی مادے کی مقدار پھیلاؤ کی قوت سے کم رہی تو کائنات یوں بھی پھیلتی رہی گی اور اس کی زوال پذیر کہکشائیں بڑھتے ہوئے خلاٗ کے سمندر میں اکیلے جزیروں کی طرح مزید ایک دوسرے سے دور ہوتی رہیں گی۔ اور اگر مادے کی مقدار اتنی زیادہ ہوگی کہ وہ کائنات کے پھیلاؤ کو روک کر اسے سکڑنے پر مجبور کر دے تو

"As the universe shrinks inexorably down to a big crunch - a sort of muror of image of the big bang, in which all of creation is squeezed again into an impossibly small volume.

کائنات جب سکڑنا شروع ہوگی تو اِس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی فلم کو الٹا چلایا جائے یعنی معلول (Effect) عِلت

(Cause) سے پہلے نمودار ہوگا۔اس وقت'

"Atoms, instead of becoming for the first time, will be broken apart. The universe, instead of becoming transparent to radiation, will become utterly opaque. The billions of years of domination by matter will be over and radiation will at last be king again."

کسی وقت ہماری اس کائنات کا اختتام تو ایک حقیقت ہے لیکن اس کی انتہا کے بعد کسی نئی کائنات کا آغاز ہو جائے گا۔ اس لئے بادشاہی تو اللہ تعالیٰ ہی کی رہے گی۔

طبیعات اور فلکیات کے ماہرین نے بلیک ہولز سے متعلقہ معلومات میں بہت اضافہ کیا ہے اور معلومات میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید اضافہ ہو رہا ہے۔

اس مضمون میں بلیک ہول سے متعلقہ انہی چند تحقیقات' اصطلاحات اور موضوعات کا مختصر الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ بلیک ہول کے بارے میں ایک عمومی تصور سامنے آجائے۔اس مضمون میں زیادہ تر مواد اسٹیفن ہاکنگ کی مندرجہ ذیل کتابوں سے لیا گیا ہے۔

1 (A beief history of time) 2 (Black holes and holy universes)

3 (Grand design) 4 (Universe in a Nutshell).

اس کے علاوہ ماہنامہ گلوبل سائنس بابت ماہ مئی 2005ء (اور بابت جون 2004) اور After glow of Creation نیز (monthly Astronomy. Nov-2007) سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

قارئین طلوعِ اسلام توجہ فرمائیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی درجِ ذیل سالانہ خوبصورت جلدیں 800 روپے فی جلد کے حساب سے دستیاب ہیں۔اپنے کتب خانوں میں ''طلوعِ اسلام'' کے فائلز مکمل کرنے کے لئے آرڈر فرمایئے۔شکریہ

1972، 1975، 1976، 1977، 1983، 1984، 1985، 1986، 1987، 1988، 1991، 1999، 2000، 2001، 2002، 2003، 2004، 2005، 2006، 2011، 2015، 2016، 2017، 2018۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ذبح ابناء کا قرآنی مفہوم

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قومِ بنی اسرائیل کی داستان قرآنِ کریم نے تفصیل سے بیان کی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق واقعات بیس سورتوں میں آئے ہیں۔ ان میں مکرر مضامین بھی آئے ہیں، اور کسی مقام پر کوئی ایک واقعہ بیان ہوا ہے اور کسی دوسرے مقام پر کوئی دوسرا واقعہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق واقعات میں یہ آیت بھی آئی ہے: یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَیَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ (2:49) قوم فرعون تمہارے لڑکوں کو ذبح کر دیتی تھی اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتی تھی۔ ذبح ابناء میں ذبح کا لفظ بہت غور وفکر کا متقاضی ہے۔ تورات میں تو یہی لکھا ہے کہ وہ سچ مچ اُن کو قتل کروا دیتے تھے۔ لیکن مصری تاریخ سے اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اس آیت کو سمجھنے کے لئے قومِ بنی اسرائیل کے متعلق معلومات ہونا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے پہلے قومِ بنی اسرائیل کے متعلق کچھ مختصر معلومات پیشِ خدمتِ عالی کی جاتی ہیں۔

حضرت ابراہیم کا خاندان کُلدانیوں کے شہر اُر میں آباد تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کا بادشاہ حمورابی تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عہد 2200 دو ہزار دو سو قبل از مسیح قرار دیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام تھے۔ وہ فلسطین میں رہتے تھے۔ یہ خطۂ ارض بہت سرسبز وشاداب تھا اور حضرت اسحٰق علیہ السلام اس کے والی تھے۔ دوسرے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے جنہوں نے تولیت کعبہ کی ذمہ داری اپنے لئے مختص کر لی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل (مردِ خدا) تھا۔ اور ان کی ہی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر میں وزیرِ خزانہ ہوئے، اور بہت عالی مقام کے حامل ہوئے تو انہوں نے اپنے کنبہ کو فلسطین سے مصر بلا لیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام چونکہ بڑے مرتبہ پر فائز تھے اس وجہ سے یہ پورا خاندان وہاں عزت کی زندگی گزارتا تھا۔ یہ خاندان وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ پھیلتا رہا اور ایک قوم بن گیا۔ یہ قوم بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔

یہ ہے وہ زمانہ جس سے ہمارا قصہ شروع ہوتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا زمانہ قریب 2100 قبل از مسیح کا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عہد 1600 قبل از مسیح کا خیال کیا جاتا ہے۔ اس دور کے بادشاہوں کا لقب فرعون تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو فراعنہ سے واسطہ پڑا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شروع زمانہ کا فرعون ریمسس دوم (Rameses II) تھا اور خروج کے وقت کا بادشاہ اس کا بیٹا منفتاح Menneptah۔ چار سو سال کے عرصہ میں بنی اسرائیل ایک مستقل قوم کی صورت

اختیار کر چکی تھی۔ یہ قوم اہلِ مصر سے بالکل الگ اور علیحدہ تھی۔ فرعون، جو اس وقت کا بادشاہ تھا، تورات کے بیان کے مطابق، ان کی کثرت اور ان کی اولاد سے خائف رہتا تھا۔ اس لئے اس نے ان کے بیٹوں کو ہلاک کرنے کا حکم دیا تھا۔

بنی اسرائیل تقریباً چار سو سال تک مصر میں رہے۔ چونکہ دوسرے ملک کے رہنے والے تھے، مصر کے بادشاہوں اور مصری عوام نے ان کو اپنے سے الگ ہی سمجھا اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کمزور سے کمزور تر ہوتے گئے۔ قرآنِ کریم نے تو ان کے دُکھوں کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی، لیکن تورات میں ان کے مصائب کا ذکر موجود ہے۔ تورات میں ہے ''اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارے اور اینٹ کا کام، اور سب طرح کی کھیت کی خدمت ان سے کروا کر، ان کی زندگی نہایت تلخ کر دی (خروج 1:13، 14) ایک دوسرے مقام پر تحریر ہے ''تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائی جنائیوں کو یوں کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے لئے تم دائی جنائی کا کام کرتی ہو تو اگر بیٹا ہو تو اس کو ہلاک کر دے اور بیٹی ہو تو جینے دو خروج 1:15، 16) بحوالہ تفسیر عروۃ الوثقیٰ، جلد اوّل، صفحہ نمبر:282)

ان حالات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کو پیغامِ الٰہی پہنچانے پر مامور ہوئے کہ وہ بنی اسرائیل پر مظالم کرنے بند کر دے اور ان کو ان کے آبائی وطن جانے کی اجازت دیدے۔

قرآن نے فرعون کے دیگر مظالم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ البتہ یہ فرمایا: يُذَبِّحُونَ اَبْنَآءَ كُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَ كُمْ ط (2:49) ترجمہ: اور جب ہم نے تمہیں خاندانِ فرعون کے پنجۂ استبداد سے جنہوں نے تمہیں نہایت عذاب میں ڈال رکھا تھا نجات دی وہ تمہارے لڑکوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے۔

ہمارے مفسرین بچوں کے قتل کے مجازی معنی کی بجائے حقیقی Literal معنی لیتے ہیں۔ لیکن یہ قرائن کے خلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر بچوں کو واقعی طور پر قتل کرتے تو بنی اسرائیل کا نام ونشان تک نہ رہتا۔ لیکن جبکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ بچے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بڑی تعداد میں موجود تھے۔ خود قرآن میں ارشاد ہے: فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ (10:83) ترجمہ: موسیٰ پر کوئی ایمان نہیں لایا سوائے اس کی نئی نسل کے۔

اس کے علاوہ سورۂ مومن میں ارشادِ عالی ہے: فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ط (40:25) فرعون نے یہ حکم دیا تھا کہ جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے ان کے لڑکوں کو ذبح کرو نیز یہ کہ حضرت ہارون ان کے بڑے بھائی تھے۔ اگر لڑکوں کو واقعی قتل کر رہے تھے تو وہ کس طرح زندہ تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذبح ابناء کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت موجود نہیں تھا۔ ذبح اور قتل کے معنی ذلیل وخوار کرنا بھی ہوتے ہیں۔ ابناءِ قوم سے مراد وہ لوگ ہیں جو مردانگی، دلیری، حق گوئی، جرأت اور ثابت قدمی کی خصوصیات رکھتے ہوں اور نساءِ قوم سے مراد وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو بزدل، خوشامدی ڈرپوک اور ابن الوقت ہوں۔ فرعون بنی اسرائیل میں پارٹیاں بناتا رہتا تھا اور اُنہیں آپس میں لڑواتا رہتا تھا۔۔ وہ بنی اسرائیل کے ان لوگوں کو تھپکی دیتا تھا جو بزدل، کمزور اور اس کے

خوشامدی ہوتے تھے۔ اوران بہادر لوگوں کو ذلیل وخوار کراتا تھا جو نڈر اور جرأت مند ہوتے تھے۔ بنی اسرائیل کے اعلیٰ کنبوں کے بچوں پر نگاہ رکھتا تھا اوران کے Talents کی نشوونما نہیں ہونے دیتا تھا۔ ''ذبح ابنا'' کے قرآنی مفہوم کے بارے میں ہم نے اپنا موقف بہت مختصر طور پر تحریر کر دیا ہے۔ اب ہم اپنے موقف کی تائید میں دلائل پیش خدمت عالی کرتے ہیں۔

(1) زیر غور آیہ نمبر (2:49) میں قرآن نے یُذَبِّحُوْنَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن سورۃ الاعراف میں یُذَبِّحُوْنَ کی جگہ یُقتِلون کا لفظ استعمال کیا گیا ہے (7:141)، اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے ذبح اور قتل کا کے ایک ہی معنی لئے ہیں۔ قتل کے بھی مجازی معنی ذلیل وخوار کرنا، کسی کو کمزور کرنا، اور غیر موثر کرنا ہیں۔ اس کے معنی علم وتربیت سے محروم رکھنا بھی ہیں۔ قتل کے مجازی معنی کے متعلق ہم آگے گفتگو کریں گے۔

(2) سورۂ یونس میں ہے: فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓی اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ (10:83) ترجمہ: موسیٰ علیہ السلام پر کوئی ایمان نہیں لایا سوائے اس کی نئی نسل کے۔ ذُرِّیَّۃٌ کے معنی اولاد اور نئی نسل کے ہیں۔ اگر بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا تو یہ ذُرِّیَّۃٌ موجود ہی نہ ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بنی اسرائیل کی اگلی نسل میں جو نوجوان پرورش پا رہے تھے وہ حوصلہ مند اور انقلابی ذہنیت کے مالک تھے۔

(3) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام زندہ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی پیدائش کے وقت قتل نہیں کیا گیا۔

(4) قوم بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک خوب پھیل چکی تھی۔ اتنی بڑی قوم کے اتنے کثیر تعداد میں بچوں کو قتل کرا دینا قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ اگر کسی قوم کے ساتھ ایسا کیا جائے کہ اس کے لڑکوں کو قتل کرا دیا جائے اور صرف لڑکیاں زندہ رہنے دی جائیں، تو کچھ عرصہ بعد وہ قوم ختم ہو جائے گی۔ یہ جُرم ایسا تھا کہ یہ چھپ نہیں سکتا تھا۔ لیکن مصر کی ساری تاریخ میں اس جرم کا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔

(5) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں بھائیوں نے فرعون کو اسلام کی دعوت دی تو فرعون اور اس کی قوم نے یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُھُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23:47)، اور کہا کہ کیا ہم ان پر ایمان لائیں جن دونوں کی قوم ہماری محکوم ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے جو نیک سلوک حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کئے تھے، ان کا حوالہ دے کر اپنے احسانات شمار کرنے شروع کر دیئے۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ (26:22)، ترجمہ: یہ وہ نعمت ہے جو تو مجھ پر جتاتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے احسانات کے جواب میں یہ فرمایا کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے خلاف یہی الزام لگایا تھا۔ اگر وہ بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرواتا تو یہ جرم تو غلام بنانے کے جرم سے زیادہ سنگین ہے اگر ایسا واقعاً ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس جرم کو سرفہرست پیش کرتے۔

ذبح ابناء کے بارے میں قرآنِ کریم نے یُذَبِّحُوْنَ اور یُقتِلون (7:141) کو مرادف المعنی استعمال کیا ہے اس لئے

قتل کرنے کے معنی پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ امام راغب نے اپنی مفردات میں تحریر کیا ہے۔

(1) قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ (51:10) ترجمہ: اٹکل دوڑانے والے ہلاک ہوں۔ شیخ الہند کے اس ترجمہ پر مولانا عثمانی نے فوائد میں تحریر کیا ''یعنی دین کی باتوں میں اٹکلیں دوڑاتے ہیں اور محض ظن وتخمین سے قطعیات کو رد کرتے ہیں۔

(2) مولانا اصلاحی نے ''تدبر قرآن'' میں اس کا ترجمہ کیا ہے ''اٹکل کے تیر تکے چلانے والے ہلاک ہوں۔'' اس آیت کی تفسیر میں انہوں نے تحریر فرمایا: ''یہ جملہ بھی ملامت وسرزنش کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اٹکل تکے کے تیر چلانے والے لوگ ہیں۔ انہوں نے اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ اس جگہ مولانا اصلاحی نے قتل کے معنی ملامت سرزنش کرنا لئے ہیں۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ اس آیت سے اگلی آیت ہے: هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ (51:11) ترجمہ: غفلت میں پڑے ہوتے ہیں بالکل بے خبر۔ یہاں قتل کے حقیقی معنی لئے جائیں اور الخراصون کو قتل کر دیا جائے۔ تو وہ غفلت میں پڑے رہنے والے کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اگلی ہی آیت نے قتل کے معنی واضح کر دیئے قرآن سے باہر معنی ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

(2) فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ (2:54) کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو اور بعض خواہشاتِ نفسانی کا قلع قمع کر دینا مراد لیتے ہیں۔

(3) قتلت الخمر بالماء۔ میں نے شراب میں پانی ملا دیا جس سے اس کا جوش ختم ہو گیا۔

(4) قتلت فلانا وقتلتهٗ۔ میں نے اس کو ذلیل کر دیا۔

(5) کسی شاعر نے کہا ہے كَأَن عسنى فى غربى مقتلة

گویا میری دونوں آنکھیں بھرے ہوئے ڈول میں رکھی ہوئی ہیں۔

(6) قتلت كذا اعلماء۔ میں نے اچھی طرح جان لیا۔

(7) قاتَلَهُم الله (9:3) خدا اُنہیں ہلاک کرے۔

(8) اَقتتلَهٗ الجن والعشق۔ اس کو جن یا عشق نے قتل کر ڈالا۔

(9) اُقتُلوا فلاناً کے معنی ہیں اُسے ایسا کر دو گویا وہ مُردوں کے برابر ہے۔

(10) ''اَلبُستان'' میں ہے اَلْمُقّتل۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو بہت تجربہ کار ہو۔

(11) اِستَقتَل فی الامر کے معنی ہیں۔ اس نے جان کی بازی لگا کر کوشش کی۔

امام راغب کے بیان کردہ ان گیارہ حوالوں سے بات واضح ہو گئی ہے کہ قتل کے معنی ہر جگہ واقعی قتل کرنا نہیں ہے۔ سیاق وسباق پر غور کر کے، اس کے اعتبار سے قتل کے معنی کرنے ہوں گے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت عام ہوتی چلی گئی تو فرعون کے درباریوں نے فرعون کو اس دعوت کا بڑے اثرات ونتائج سے انتباہ کیا تو فرعون نے اس دعوت کو دبانے کے لئے جو اقدامات لینے تھے قرآن کریم نے اس کو کید (40:125) تدبیر وترکیب کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ اس کید کی شرح سورۂ قصص کے شروع میں بیان ہوتی ہے: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي

الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (28:4) ترجمہ: بیشک فرعون سرزمین مصر میں بہت سرکش ہوگیا تھا اور اس نے اس کے باشندوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک طبقہ کو اس نے دبا رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھتا۔ بیشک وہ فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔

سورۂ قصص کی یہ آیت بہت غور کی متقاضی ہے اس آیت کے دو حصے ہیں جن میں سے ایک حصہ دوسرے حصہ کی وضاحت کر رہا ہے۔ فرعون کو زمین میں اقتدار حاصل ہوا۔ اس نے اپنی رعایا کو قابو میں رکھنے کے لئے Divide and Rule کا اصول اختیار کیا۔ ایک طبقہ کو تھپکی دیتا اور دوسرے حصہ کو دبا کر رکھتا تھا اس تدبیر کو عملی طور پر وہ اس طرح استعمال کرتا تھا کہ بزدل، خوشامدی، لالچی لوگوں کو اپنے قریب رکھتا تھا، اور بہادر لوگوں کو ذلیل وخوار کرتا تھا اور اس طرح ان کو آپس میں لڑا کر حکومت کرتا تھا۔

جیسا کہ شروع میں تحریر کیا جا چکا ہے حضرت موسیٰ کو دو فرعونوں سے واسطہ پڑا تھا جو باپ اور بیٹے تھے۔ قرآن نے یہ واضح نہیں کیا کہ یہ حکمت عملی دونوں فراعنہ کی تھی یا صرف ایک کی اور اگر ایک کی تھی تو باپ کی تھی یا بیٹے کی۔

مضمون یہاں ختم ہوا۔ ہمیں جو عرض کرنا تھا وہ پیشِ خدمت کر دیا گیا ہے۔ ''ذبح ابناء'' کا یہ مفہوم عام روشنی سے ہٹ کے ہے اس لئے قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اس مضمون کو غور سے اور بغیر کسی Mental Reservation کے مطالعہ فرمائیں۔

ہمارا مضمون ختم ہوا۔ ہم اپنے معزز قارئین کرام کی ازدیادِ علم کی غرض سے یہ چند سطور رقم کر رہے ہیں کیونکہ ان کا تعلق بھی فرعونی سیاست کی وضاحت سے ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر ہندو پاک میں تجارت کرنے کی غرض سے آئی تھی، لیکن ساتھ ساتھ فرعونی سیاست کرتی رہی۔ لارڈ کلائیو Lord Clive اس کمپنی میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا۔ اس کے ساتھ صرف دو سو انگریز سپاہی تھے۔ باقی سپاہی ہندو، مسلمان، مقامی تھے۔ کلائیو بہت Talented تھا اور اسی وجہ سے ترقی کرتے کرتے فوج کا انچارج ہوگیا۔ کمپنی نے یہاں کے نوابوں، راجاؤں کو لڑا کر اپنا اقتدار وسیع کیا۔ اس زمانہ میں انگلینڈ کی آبادی ایک کروڑ تھی اور برصغیر کی 20 کروڑ۔ 1857ء میں جب یہاں غدر ہوا۔ وہ انگریزوں کی پالیسی کے خلاف تھا۔ انگریزوں کو معلوم تھا بادشاہ بہت ضعیف و کمزور ہے اور کچھ عرصہ کے لئے ہے۔ وہ بیگمات اور شہزادوں کو لڑاتے رہے۔ ان کی سکیم تھی کہ شاہ ظفر کے مرنے کے بعد بادشاہت کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ کمزور ترین شہزادہ کو اس کا جانشین بنا دیا جائے۔ کچھ عرصہ بعد اس شہزادہ کو بھی بہانہ سے قلعہ معلّٰی سے نکال کر کسی بہت بڑے Palace میں منتقل کر دیا جائے اور اس طرح بغیر کسی خون خرابے کے مغلئ دور ختم کر دیا جاتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ساری سیاست فرعونی سیاست تھی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دوقومی نظریہ پاکستان کی اِسلامی مملکت میں اِنسانی ذات کا ارتقاء

باب نمبر:2

اللہ کی ناقابلِ اِدراک ذات کا اُس کی قابلِ اِدراک صِفات پر مرتب قانون کے اِطلاق سے اخذ کردہ تصورِ خالق

حضرتِ انسان روز اول سے متجسس واقع ہوا ہے اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مختلف امور سے متعلق اس کے تجسس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ انسان کا یہ تجسس بڑھتے بڑھتے یہاں تک آ پہنچا کہ اس بات کا پتہ چلایا جائے کہ اُس کا اپنا وجود کس مقصد کی خاطر ہے؟ اسے کیوں بنایا گیا اور کیسے بنایا گیا؟ دوسری مخلوقات میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ انسان ہمیشہ سے ان سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی کوشش میں مصروف پایا گیا ہے۔ انسان کا یہ تجسس صرف یہیں تک محدود نہ رہا بلکہ اشرف المخلوقات نے تخلیقِ انسانیت سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر تخلیق کائنات سے آگاہی کی کوشش شروع کر دی اور اس سب کا مقصد انسانیت کی پیدائش کے ابتدائی مرحلے سے آگاہی حاصل کرنا تھا۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ انسان کے ذہن میں خدا "یعنی کسی مافوق الفطرت ہستی یا قوت کا خیال پیدا کیسے ہوا۔ مغرب کے علمائے عمرانیات کا آج سے کچھ عرصہ پہلے تک اور اب بھی وہاں اس سبب میں لوگوں میں دیوی/ دیوتا سے اِسے منسوب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ جب ابتدائی دور کے انسان کا شعور ہنوز عہد طفولیت میں تھا، نے یہ دیکھا کہ بعض حوادث ایسے آتے ہیں جن کے علل واسباب کا اسے کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اِس میں خصوصی طور پر بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج، طوفانِ بادوباراں، زلزلے، وبائی امراض وغیرہ، تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو ان حوادث کے پیچھے کوئی بڑی بڑی قوتیں ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں۔ اس سے اس کے ذہن میں "خدا" (دیوی، دیوتاؤں) کا تصور پیدا ہوا۔ اگر دیکھا جائے تو ان تمام سوالات کے تسلی بخش جوابات صرف اور صرف وہ ذات ہی دے سکتی ہے جو ان تمام اسرار ورموز سے آگاہ ہو اور وہ تو صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہی ہے۔

1۔ اللہ کا لغوی واصطلاحی مفہوم:

لغوی طور بھی دیکھا جائے تو اللہ کی غیر مرئی قوتیں کے لئے عمومی طور پر اَلٰہَ، اِلَیۡہِ، یَاۡلَہُ کے الفاظ بولے جاتے تھے جس کے معنی ہیں گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا متحیر ہونا ہیں۔ اَلَہَ، یَاۡلَہُ کے معنی یہ بھی ہیں کسی کو پناہ دینا، امان میں لینا۔ ان

معانی کے اعتبار سے "اِلٰہٌ" کے معنی ہوں گے ایک ایسی ہستی جس سے خطرات میں پناہ حاصل کی جائے جس سے مشکلات دور کرنے کی استدعا کی جائے اور جس کی عظمت و بلندی کے تصور سے انسان متحیر ہو جائے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ ''لَاہَ، یَلِیْہُ'' سے مشتق ہے جس کے معنی بلند مرتبہ ہونا اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ''اَلَہَ'' کے معنی ہیں وہ شخص غلام بن گیا اور ''اَلَّھَہٗ'' کے معنی ہے کہ اُس نے اسے غلام بنالیا۔ اس اعتبار سے ''اِلٰہٌ'' کے معنی ایسی ہستی ہوں گے جس کا غلبہ و اقتدار اختیار کیا جائے جس کے قانون کی اطاعت کی جائے جس کی محکومی اختیار کی جائے۔

آپ غور کیجئے کہ ذہن انسانی نے ''معبود'' کے جس قدر تصورات بھی قائم کیے ہیں، ان میں مندرجہ بالا خصائص کسی نہ کسی شکل میں ضرور پائے جاتے ہیں۔

1۔ ان کا بلند و بالا ہونا۔

2۔ نگاہوں سے پوشیدہ ہونا۔

3۔ اس کے تصور سے حیرت زدہ ہو جانا۔

4۔ مشکلات سے گھبرا کر اس کی طرف مدد کے لیے رجوع کرنا۔

5۔ تذلل و تعبد سے اس کے سامنے جھکنا اور

6۔ اس کے احکام کی اطاعت کرنا۔

بالفاظ دیگر ''اِلٰہٌ'' وہ جامع لفظ ہے جو ''خدا'' کے ہر قسم کے تصور کو محیط ہے۔ اس طرح انسان کے ذہن میں ''خدا'' کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور مختلف ممالک کے احوال و ظروف اور مختلف قبائل کے ماحول و کوائف کے ماتحت مختلف تھا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا اور انسان ترقی کرتا گیا اس تصور میں بھی جلا پیدا ہوتا گیا۔ اس طرح بتدریج ''خدا'' کا وہ تصور وجود میں آ گیا جو دنیا کے بلند مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کو اللہ کا ارتقائی نظریہ کہا جاتا ہے۔ مشہور یونانی مورخ، پلوتارک (PLAUTARCH-AD 42-107) اس باب میں لکھتا ہے:

زمین پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھو گے:

1۔ جن کی دیواریں نہیں ہیں۔

2۔ ایسے بھی جن میں علم کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی۔

3۔ ایسے بھی جہاں حکمران کوئی نہیں۔

4۔ ایسے بھی جہاں نہ محلات ہیں نہ ورزش گاہیں، نہ تھیٹر

اِس کے باوجود تم اِن میں سے کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے جہاں دیوتاؤں کے مندر نہ ہوں، جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہوں، جہاں منتیں نہ مانی جاتی ہوں۔ ایسا شہر نہ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئے گا۔

جس قسم کا خدا کا تصور کسی کے ہاں ہوگا، اسی قسم کی اس فرد کی زندگی اور اس جماعت (یا قوم) کا معاشرتی نقشہ ہوگا۔ یہ

غالباً مغربی مفکر کانٹ تھا جس نے کہا تھا کہ تم مجھے یہ بتادو کہ فلاں قوم نے کس قسم کا معبود پرستش کے لیے اختیار کر رکھا ہے اور میں تمہیں اس قوم کی تہذیب وتمدن کے متعلق سب کچھ بتادوں گا۔

2۔ مذاہب کی دنیا میں اہلِ کتاب میں الٰہ کا تصور:

مذہب کی بنیاد ہی خدا کے ایمان پر رکھی جاتی ہے۔ مختلف مذاہب میں خدا کا نام بدل جائے گا لیکن اس کی ہستی کا اقرار، اس پر ایمان، ہر جگہ شرط اولین ہوگا۔ اس سے لازماً یہ سوالات سامنے آتے ہیں کہ

1۔ خدا کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ اسے ماننا کیوں ضروری ہے؟

2۔ اس کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے؟

3۔ انسان اور خدا کا باہمی تعلق کیا ہے؟

یہ سوالات جیسا کہ ظاہر ہے بڑے اہم، بڑے مشکل اور بڑے نازک ہیں اور جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ان کے اطمینان بخش جواب کے لیے مصروفِ تحقیق وکاوش ہے۔ اہل کتاب میں یہودیت میں اسرائیل کے بادشاہ فرعون نے کہا کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اس سے الٰہ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی دعوت یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی محکومی سے نکال کر آزادی کی فضا میں بسایا جائے، جہاں وہ خالص خدا کے احکام کی اطاعت کریں۔ فرعون کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کی مملکت میں اطاعت وفرماں پذیری اسی کی ہوسکتی ہے، اس لیے بنی اسرائیل کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ کسی اور کے قوانین کی پابندی اختیار کرلیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرک یہی نہیں کہ انسان پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہو، اس سے کہیں بڑا شرک یہ ہے کہ انسان قوانین خداوندی کی جگہ انسانوں کے خودساختہ قوانین کی اطاعت کرے۔

اہلِ کتاب میں عیسائیت میں خدا کے تصور میں تثلیث کا عقیدہ پایا جاتا تھا۔ عیسائی تین خدا مانتے ہیں: باپ، بیٹا، روح القدس۔ یہ عقیدہ بھی باطل ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ (5:73)

''بلاشبہ وہ لوگ (حق سے) منکر ہوئے جنہوں نے کہا کہ خدا تین میں ایک کا ہے۔ حالانکہ بجز اس ایک الٰہ کے اور کوئی الٰہ نہیں۔''

یونان کے اقنون ثلاثہ کا عقیدہ جو آریہ ورت میں آکر روح، مادہ اور خدا کا عقیدہ بنا، وہ بھی تبعاً اسی میں شامل ہیں۔

اہل کتاب نے مذہبی احبار ورہبان، علماء ومشائخ کو خدا کا شریک بنالیا تھا۔ یہ عقیدہ انسانی عظمت وتقدس کا نقاب اوڑھ کر عقیدت وارادت کے راستے رگ وپے میں سرایت کرجاتا ہے اور کچھ اس طرح دل کی گہرائیوں میں اپنا گھر بنالیتا ہے کہ اس سے باہر نکلنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

"اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" (۹/۳۱)

اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَالۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ (9:31)

''انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو خدا بنالیا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو حکم یہی دیا گیا تھا کہ وہ اسی ایک الٰہ کی عبودیت اختیار کریں جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ وہ ان کے شرک سے بلند ہے۔''

3۔ اہلِ الکتاب کے علاوہ دیگر مذاہب میں خدا کی متعدد صورتوں کا تصور:

اہلِ کتاب سے علیحدہ دیگر مذاہب میں مجوسی (پارسی، جو اپنے آپ کو جناب زرتشت کے پیرو کہتے ہیں) دو مستقل خدا مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا خدا، ایک برائی کا، ایک نور کا خدا، ایک ظلمت کا۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید فرمادی۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اِلٰهَيۡنِ اثۡنَيۡنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارۡهَبُوۡنِ (16:51)

''اور اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ دو الٰہ اختیار نہ کرو، الٰہ وہی ایک ہے۔ سو تم لوگ صرف اسی کے قانون کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خوف کھاؤ۔''

اِس میں شبہ نہیں کہ بعض مذاہب، مثلاً بدھ مت، ایسے ہیں جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں لیکن خود بدھوں کی حالت یہ ہے کہ وہ مہاتما بدھ کی خدا کی طرح پرستش کرتے ہیں، سو فرق صرف نام کا ہے، تصور ہر جگہ وہی ہے۔

ان محسوس شکلوں کے علاوہ قرآن کریم شرک کی ایک ایسی شکل بیان کرتا ہے جسے انسان کی آنکھ بھانپ نہیں سکتی تھی۔ اس غیر محسوس شے کو شرک قرار دینا صرف اس خدائے علیم و بصیر کا کام ہے جو دل کی گہرائیوں میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے کہ:

اَفَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنۡ يَّهۡدِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ (45:23)

''کیا تو نے اس کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا الٰہ بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانون خداوندی نے اسے باوجود علم کے گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں پر اور قلب پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح راستہ کی طرف راہ نمائی اللہ کے قانون کے مطابق ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ کیا تم پھر بھی نصیحت نہ حاصل کرو گے؟

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ ایک سے زیادہ الٰہ مقرر کر لینے سے فساد رونما ہوجاتا ہے۔ غور کیجئے کہ آج یہ جو ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو رہا ہے تو کیا اس کی یہی وجہ نہیں کہ ہر انسانی قلب، صنم کدہ بن رہا ہے؟ ہر گروہ اور ہر قوم اپنی اپنی خواہشات کو خدا بنائے بیٹھی ہے اور اس ''خدائے خواہشات و جذبات'' کے تغلب و تسلط میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ قرآن کے مطابق یہ شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی ہے جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں جا گرتا ہے۔ مذاہب کی دنیا میں ہر مذہب میں اعتقادی دعوؤں کے حق میں کوئی ایک بھی علم کی سند پر تسلی بخش ثبوت پیش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ عیسائی سے پوچھیں تو وہ اپنی کتاب بطور ثبوت آگے کر دے

گا، کسی ہندو سے پوچھیں تو وہ اپنی کتابیں آگے کر دے گا، کسی مسلمان سے پوچھیں تو وہ اپنی کتاب بطور ثبوت پیش کر دے گا۔سب کی ایک ہی بات کہ ہماری کتاب خدا نے ہدایت کیلیے بھیجی۔سب کی اپنی اپنی تاویلات ہیں جن سے وہ اپنے اپنے خدا کو اپنے دعووں کے حق میں ثابت کرتے ہیں۔اُن کے سامنے کوئی خدائی عِلم کی راہنمائی نہیں، بلکہ انسان خود اپنی طرف سے پیش کردہ تاویلات سے خدا کے وجود کو منوا رہا ہے۔بہرحال یہاں کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ جس پر چل کر خدا کو مانا جائے اور منوایا جائے۔صِرف معجزات وعقائد کے چند وہم ہیں، جو خوف کی صورت میں خدا پر ایمان رکھنے کے مؤجب بنے ہوئے ہیں۔اگر مقصود اللہ کی حقیقت وصداقت مطلوب ہے، تو اُس تک رسائی کے راستے معجزات وعقائد کی راہنمائی میں طے نہیں کئے جاسکتے، بلکہ اُس کی خلقت پر غور وفِکر سے عقلی وعلمی صلاحیتیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔

4۔ذہنِ انسانی کا اپنا پیدا کردہ خدا کا تصور:

زمانۂ قدیم میں اِنسان اپنے ذہن سے تراشید کر کے خدا کے اِنسانی تخلیق پر قادر ہونے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اِس کے لئے اُس کے ذہن میں اِسی قسم کے سوالات جنم لیتے رہتے کہ اگر انسان کے دو ہاتھ ہیں، تو خدا کے چار ہاتھ ہوں گے۔اگر انسان ایک پتھر اُٹھا سکتا ہے تو خدا ایک پہاڑ اٹھالے گا۔انسان کا قد پانچ چھ فٹ کا ہوتا ہے، خدا کا قد پچاس ساٹھ فٹ کا ہوجائے گا۔ہندوستان کے دیوی دیوتا اور اصنامیات یونان کے مجسمے اسی تصور کے مظاہرات ہیں۔انسان کا ذہن، انسان اور مظاہر فطرت سے الگ ہوکر خدا کا کوئی تصور پیدا کرنے کا اہل ہی نہیں ہوا تھا۔

ویدوں میں خدا کا تصور ہے کہ برہمن اس کے منہ سے (پیدا) ہوئے اور اس کے بازوؤں سے کشتری ذات کے لوگ پیدا ہوئے جو ویش ہیں، وہ اس کی ٹانگوں سے پیدا ہوئے اور پرمیشور کے دونوں پاؤں سے بیچارے شودر پیدا ہوئے۔چاند اس کے منہ سے پیدا ہوا اور آنکھوں سے سورج پیدا ہوا۔منہ سے اندر اور اگنی دیوتا پیدا ہوئے اور سانس سے ہوا پیدا ہوئی! وہ سانپوں، اُسترے اور بخار کو سجدہ کرتے بھی دکھائی دئے جاتے۔اوتار کا عقیدہ بھی انسان کے اسی رجحان کا آئینہ ہے اس نے جہاں کسی انسان میں کوئی ایسا جوہر دیکھا جو عام انسانوں میں کم ملتا ہے اسے فوراً فوق البشر کی شکل میں خدا تصور کرلیا قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ جب سے انسان میں تمدنی شعور بیدار ہوا خدا کی طرف سے بوساطت انبیائے کرامؑ، وحی کے ذریعہ نوعِ اِنسانی کی طرف رہنمائی آنا شروع ہوگئی۔ہر نبی کی طرف سے راہنمائی کا نقطہ ماسکہ خدا کے نظریہ توحید کا تھا، لیکن ہوتا یہ رہا کہ ایک رسول آتا اور خدا کے اس بلند وبالا تصور کو نہایت وضاحت سے پیش کر دیتا۔کچھ عرصہ کے بعد یہ حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی اور محسوسات کا خوگر انسان، الوہیت کے اس صاف اور شفاف تصور میں اپنی ذہنی رنگ آمیزی کرنے لگ جاتا۔کبھی وہ ان چیزوں کو اپنا معبود بنالیتا جن سے وہ ڈرتا اور خوف کھاتا، کبھی ان کو جن سے وہ اپنی کچھ توقعات وابستہ کرتا۔کبھی ان ذہنی اور خیالی معبودوں کی عظمت وتقدیس کے پیش نظر ان کے مجسمے کھڑے کرتا، بت تراشتا چنانچہ یہ مختلف دیوی دیوتا، اندر، اگنی، سورج، چاند، گنگا، جمنا، سانپ، گائے، بیل، سب اسی جذبہ خوف وامید (یعنی دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت) کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں۔جب ذہن انسانی پر اس طرح توہم پرستی کی تاریکیاں چھا جائیں تو پھر ایک اور

رسول آجاتا اور خدا کے پاکیزہ توحید کے تصور کو وحی کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیتا اور انہیں واضح الفاظ میں بتا دیتا کہ انسان اشیائے کائنات کا مسجود ہے۔ اس میں ایسی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں جن کی رو سے یہ اشیائے فطرت کو مسخر کر سکتا ہے اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے اس کی کنہ وحقیقت اور ماہیت و کیفیت کا سمجھنا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں۔ ایک محدود ذہن، لامحدود کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ خدا تو بہت بڑی چیز ہے۔ دور حاضر کے مفکرین اور سائنسدان ہمیں بتاتے ہیں کہ زمان کی کوئی ابتدا نہیں اور مکان کی کوئی حد نہیں۔ یعنی یہ کہنا غلط ہے کہ زمانہ فلاں وقت سے شروع ہوا اور کائنات کی فضا کا آخری کنارہ وہ ہے۔ نہ زمانہ کا کہیں سے آغاز ہوا، نہ فضا کا کوئی آخری کنارہ ہے۔ فلسفہ اور سائنس ہمیں یہ بتاتے ہیں، لیکن آپ اپنے ذہن پر زور ڈالئے اور ایک ''لا ابتداء'' یا ''لا انتہا'' مکان کا تصور قائم کرنے کی کوشش کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ذہن میں ان کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ آپ جتنا زیادہ ذہن پر زور ڈالیں گے اتنی ہی جلدی آپ جھنجلا اٹھیں گے۔ سو جب زمان اور مکان کے تصور کی یہ حالت ہے، تو خدا کی ذات کا تصور (جو زمان و مکان کا خالق ہے) کس طرح انسان کے حیطہ ادراک میں آ سکتا ہے؟

قدیم نظریہ ارتقاء کے مطالعہ میں ہم نے دیکھا کہ لوگ خدا کا متعدد دیوی دیوتاؤں کو خیالی انسانی مجسم و مُثبت و منفی صِفات کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ ہمارے ہاں کے فرقۂ معتزلہ کے نے اللہ الواحد کی صِفات میں مجسم دیوی دیوتاؤں کو ہی نہیں نکالا، بلکہ اللہ میں انسانوں جیسی صِفات رکھنے کی بھی نفی کر دی۔

5۔ اللہ کی غیر جسمی ماہیت میں معتزلہ کا مؤقف:

اللہ کی ماہیت کے بارے میں امام الحسن نے اپنی کتاب مقالاتِ الاسلامین میں مُعتزلہ کے مؤقف کی وضاحت میں فرمایا کہ:

1۔ خدا ایک ہی منفرد ہے۔

2۔ وہی الاوّل والآخر ہے۔ مخلوقات سے قبل موجود ہے اور اُس کی ذات کو فنا نہیں۔

3۔ وہ عالم وقادر ہے اور ہمیشہ کے لئے زندہ و پائندہ ہے۔

4۔ اُس نے جو چاہا پیدا کر دیا۔ اُس نے کوئی چیز مثال دیکھ کر پیدا نہیں کی۔

5۔ وہ جسم رکھتا ہے نہ کالبد۔ نہ اس کا جُثہ ہے نہ صورت۔

6۔ وہ نہ جوہر ہے نہ عرض۔

7۔ نہ اس کا ذائقہ ہے اور وہ خوشبو بھی نہیں رکھتا ہے۔

8۔ اسے چھوا بھی نہیں جا سکتا۔

9۔ نہ اس میں حرارت ہے نہ رطوبت۔

10۔ وہ طول بھی نہیں عرض بھی نہیں اور عمل بھی نہیں۔

11۔ نہ اس میں اجتماع ہے نہ افتراق۔ نہ متحرک ہے نہ ساکن۔

12۔ نہ اس کے الگ اجزاء ہیں اور وہ جوارح و اعضاء بھی نہیں رکھتا۔

13۔ وہ ذی جہات بھی نہیں نہ اس کا کوئی دایاں ہے نہ بایاں۔ نہ آگا ہے نہ پیچھا

14۔ وہ اوپر بھی نہیں نیچے بھی نہیں

15۔ کوئی مکان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا اور زمانہ اس پر حاوی نہیں ہو سکتا۔

16۔ وہ جدا بھی نہیں اور مِلا ہوا بھی نہیں

17۔ وہ کسی ایسے وصف سے متصف نہیں کیا جا سکتا جو خلق میں پائے جاتے ہوں اور حادث و فانی ہوں

18۔ نہ اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ متناہی ہے۔

19۔ اسے ناپا بھی نہیں جا سکتا۔

20۔ وہ مُختلف جہات میں سمایا ہوا نہیں۔

21۔ وہ محدود بھی نہیں۔

22۔ نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا۔

23۔ تقدیریں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور پردے اسے مستور نہیں کرتے۔

24۔ وہ حواس کے ادراک سے بالا ہے۔

25۔ اسے لوگوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور مخلوقات سے کسی طرح مماثلت نہیں رکھتا اس لئے کہ

26۔ نہ اس پر آفات کا نزول ہو سکتا ہے اور نہ مصیبتیں اسے گھیر سکتی ہیں

27۔ ہر وہ تصور جو وہم میں آ سکتا ہے اور ہر وہ بات جو تصور میں آ سکتی ہے، اس کی مشابہت سے ماوراء ہے۔

28۔ نہ اُسے آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ نہ بینائی اُس کا ادراک کر سکتی ہے

29۔ اذہان اس کا احاطہ نہیں کر سکتے اور سماعت اسے سُن نہیں سکتی

30۔ وہ الظاہر والباطن ہے۔

31۔ اُس مین خون بھی نہیں گوشت بھی نہیں۔

32۔ صرف وہی قدیم ہے اور کوئی قدیم نہ ہے۔

33۔ صرف وہی معبود ہے اور اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔

34۔ نہ کوئی اس کے اقتدار میں شریک ہے اور نہ اس کا کوئی وزیر مختار ہے۔

35۔ نہ اسے کوئی نفع پہنچ سکتا ہے نہ نقصان

36۔سرور ولذات سے وہ بیگانہ ہے اور اذیت والم سے نا آشنا ہے

37۔نہ وہ ذی غایت ہے کہ اس کی انتہا ہو

38۔اس کی مرضی وتکوین میں کوئی اس کا معین ومددگار نہیں

39۔نہ اس میں کسی قسم کی کوتاہی یا کمی ہے اور نہ مجبوری اور بے چارگی

40۔نہ اُس کی کوئی بیوی ہے نہ اولاد

معتزلہ نے جہاں انسان سے مشبہ صفات کا ذکر قرآن میں آیا ہے، اُن کی تاویل اُنہوں نے یہ کی ہے کہ یہ ذاتِ باری تعالٰی کے اسماء/ صِفات ہیں، لہٰذا اِن کا تعلق انسانی جسم سے مُطلق نہیں بنتا۔ ذاتِ خداوندی کی ماہیئت کا علم، انسان کی سرحد ادارک سے ماورا ہے۔

قرآن سے بھی اِس کی تصدیق کی گئی ہے کہ ایسی بھی کچھ صفات ذات باری تعالےٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہیں اور اِن صِفات میں کوئی بھی اللہ کا اِدراک نہیں کر سکتا۔ قرآن میں ہے کہ

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ (57:3)

وہی اوّل وآخر وظاہر وباطن ہے۔

یہاں چار صِفات کا ذکر ہے۔

1۔الاوّل 2۔الآخر 3۔الظاہر 4۔الباطن

اِن صِفات کے مفہوم کا بیان کیا جاتا ہے کہ

1۔اللہ تعالٰی جہت زمان ومکان سے بلند وبالا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو وہ موجود تھا (الاول)۔

2۔جب کچھ نہ ہوگا تو وہ موجود رہے گا (الاخر)

3۔4۔ظاہر وباطن ہر جگہ موجود ہے۔

اِن کے علاوہ قرآن نے دو مزید اللہ کی ذات سے مختص صِفات کا ذکر کیا ہے کہ

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۣ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ (22:66)

''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زندگی عطا فرمائی۔ پھر وہ تمہیں مارے گا۔ اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔''

یہاں درجِ ذیل دو صِفات کا ذکر ہے. جو اللہ ہی کی ذات سے مختص ہے۔

5۔احیاء (زندگی) 6۔اماتت (موت)

موت اور حیات بھی اس کے ہاتھ میں ہے، جس میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔

اِس کی وضاحت میں کہا گیا ہے کہ

وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (25:3)

موت وحیات اور نشور میں اللہ کے سوا کسی کا اختیار نہیں لہٰذا وہ انسان جو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کر سکا کہ وہ خود کیا ہے، وہ کیا معلوم کر سکے گا کہ خدا کیا ہے۔ وہ قوت جو نظم ونسق عالم کو برقرار رکھے ہوئے ہے ماننے والوں کے نزدیک خدا ہے اور نہ ماننے والوں کے نزدیک فطرت ہے۔ نہ ان کا ذہن ذات خداوندی کی ماہیت کا احاطہ کر سکتا ہے نہ یہ فطرت کی حقیقت بتا سکتے ہیں۔ ذہن انسانی محسوسات کی حد تک علت ومعلول کے سلسلہ کو معلوم کر سکتا ہے لیکن علت العلل کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔

مغرب یعنی اہل کتاب کے مذاہب میں خدا کو وہ غیر مجسم روح سمجھا جاتا ہے جو جسم کی قید سے آزاد ہے۔ وہ ہر چیز دیکھ، سن اور جان سکتا ہے۔ المختصر وہ غیر جسمی ذہن یا عقل ہے، ایک ایسا شعور جو جسم سے الگ ہے مگر سوچنے، محسوس کرنے اور ارادہ کرنے اور اس پر عمل کرنے پر قادر ہے۔ خود جسم نہ ہوتے ہوئے بھی اجسام کی تخلیق اور انھیں محرک کرتا ہے اور محض ارادہ سے اشیاء کو وجود میں لا سکتا ہے۔

8۔ جدید حکماء مغرب کا اللہ کے تصور سے متعلق ذہنی کاوشوں کا جائزہ:

آپ تاریخ انسانی کے کسی دور سے گزریے اور دنیا کے کسی خطہ پر نگاہ ڈالیے، ایک چیز آپ کو ہر مقام، ہر قوم اور ہر زمانے میں اللہ کا تصور بطور قدر مشترک ملے گا، لیکن اِس کے بارے میں بھی کسی مفکر کا تصور دوسرے سے نہیں ملتا۔ وہ سبھی اپنے اپنے موضوع کی بنیاد پر خدا کا تصور پیش کرتے ہیں۔

1۔ کانٹ کے نزدیک ''خدا وہ ہے جو انسانوں کو اخلاقی ضابطہ دیتا ہے۔''

2۔ ولیم جیمز خدا کو ''کائنات کا حصہ اعلیٰ'' قرار دیتا ہے۔

3۔ میتھیو آرنلڈ کہتا ہے کہ ''خدا اس قوت کا نام ہے جو خیر کا سبب ہے۔''

4۔ سر جیمس جینز کے نزدیک ''خدا سب سے بڑا ریاضی دان ہے۔''

5۔ برگسان کے نزدیک خدا سے مفہوم ''تخلیقی توانائی'' رہا ہے۔

6۔ آئن سٹائن ذاتی خدا کے تصور سے نا آشنا تھا، اس کے برعکس وہ یہ کہتا تھا کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے محدود وسائل کی مدد سے کارخانہ قدرت کا راز جاننے کی کوشش کرے، پھر اُسے پتہ چلے گا کہ اس تمام سلجھی ہوئی ڈور کے پیچھے نہایت لطیف انداز میں ایک غیر مادی اور نہ سمجھ میں آنے والی قوت کارفرما ہے، اس قوت کی ستائش اور تکریم، جو ہمارے فہم سے ماورا ہے، ہی میرا مذہب ہے!

ان چند مثالوں سے یہ حقیقت سامنے آ گئی ہوگی کہ ''خدا'' کے صحیح تصور کے متعلق مفکرین کسی ایک نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ان میں سے ہر ایک کا تصور الگ اور تعریف جداگانہ ہے، یہ اس لیے کہ جب یہ لوگ خدا کے متعلق بات کرتے ہیں تو یہ بات خدا کے متعلق نہیں ہوتی بلکہ اس تصور کے متعلق ہوتی ہے جو یہ خدا کے متعلق اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ ہر فرد کے ذہن کا تراشیدہ تصور الگ ہوتا ہے، اس لیے ایک کا تصور دوسرے سے نہیں مل سکتا۔ شین کے الفاظ میں ''ایک فرد اور دوسرے فرد کا خدا جداگانہ ہوگا۔ حتیٰ کہ ایک فرد کے احساسات وجذبات کی مختلف حالتوں میں بھی اس کا خدا مختلف ہوگا۔ ہر انسان اپنے جذبات کے تعمیر کردہ مندر کا پجاری ہے۔''

اِس کے ثبوت میں وہ عقل سے کئی دلائل دیتے ہیں۔ حُکمائے مغرب نے بہت سے دلائل دئے ہیں، لیکن ہم یہاں طوالت کے خوف سے بچنے کے لئے علامہ اقبال کی طرف سے دی گئی تین اہم دلیلوں نشاندہی کرنے پر ہی اِکتفاء کررہے ہیں۔

1۔ کونی دلیل 2۔ غائیتی دلیل 3۔ وجودی دلیل

یہ اولہ ثلاثہ اگرچہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ فکرِ انسانی نے جب کبھی ذات مطلق (واجب الوجود) کی جستجو کی تو چاروناچار انہی تین راستوں پر گامزن ہونا پڑا، لیکن منطقی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں کوئی دلیل بھی ذات مطلق کے اثبات پر دلالت نہیں کرتی۔ ان کے دلائل پر شدید اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور اِسی تنقید کی وجہ سے حُکمائے مغرب خود اعتراف کررہے ہیں کہ وہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

9۔(1) پہلی کونی یا علی دلیل کا مؤقف:

کونی یا علی دلیل کا واضح ترین بیان یوں ہے کہ ہر شے کا ایک سبب/عِلت ہوتی ہے اور اسی لیے کائنات کا بھی ایک سبب ہے اور وہ مسبب الاسباب خدا کی ذات ہے۔ لہٰذا لازمی طور پر خدا کا وجود ہے۔

اِس دلیل کی رو سے کائنات ایک معلولِ منتہاہی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی کوئی عِلت بھی ہو۔ لیکن پھر ہر عِلت کے لیے چونکہ ایک دوسری عِلت کا وجود مستلزم ہے اور ذہن انسانی کے لیے ممکن نہیں کہ ایک ابدی تقہقر یعنی ماضی کی طرف ہٹتے ہوئے علت و معلول کے ایک لامتناہی سلسلے کا تصور کرتا چلا جائے۔ اس لیے ایک ایسی علت سے خدا کا وجود تسلیم کرنا پڑا جو کسی دوسری علت کا معلول نہیں۔ اِسے وہ عِلت اولیٰ، عِلت العلل اور یا پھر مسبب الاسباب کا نام دیتے ہیں۔

علی دلائل کا تجزیہ اور تنقید کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ سبب کسی زمانی وقوعہ یا عمل کا ہوا کرتا ہے لہٰذا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ سبب کے بدلے کسی شے کا وجود میں آنے کا سبب ہوتا ہے۔ لیکن کیا کائنات ایک شے ہے؟ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ لفظ ''کائنات'' ایک اسم جمع ہے اور کائنات اشیاء کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان تمام اشیاء کا جو موجود ہیں۔ علّی دلیل کا ناقد یہی اعتراض کرتا ہے کہ وقوعات کے منفرد اسباب کا طلب کرنا اور ان کے جوابات حاصل کرنا جائز ہے مگر وقوعات کے مجموعی سلسلہ کا الگ سے سبب ڈھونڈنا بے معنی ہے۔

دوسرے ہم اگر یہ فرض کرلیں کہ مکمل کائنات کا سبب ڈھونڈنا معقول ہے اور اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ اس کا سبب خدا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا سبب کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''ہر شے کا سبب ہوتا ہے'' کا معنی خدا کے سوا ہر شے کا سبب ہوتا ہے لیکن جیسا کہ ہیوم نے کہا ہے کہ ہم کیوں اس جگہ علت و معلول کا سلسلہ ختم کرتے ہیں۔ اگر رکنا ہی ہے تو کیوں نہ ہم کائنات یا دنیا پر ہی علّی سلسلہ کا اختتام تسلیم کریں جسے ہم کسی حد تک جانتے ہیں اور جس کا ہمیں تجربہ بھی ہے۔ بہرحال تجربی اقلیم سے ماورا اسباب و علل کا سلسلہ لے جانا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسباب کے متعلق ہمارا علم زمانی و مکانی اشیاء، اعمال و وقوعات تک محدود ہے، اس کے آگے اسباب کے متعلق کچھ کہنے کے ہم مجاز نہیں کیونکہ تجربات ہمیں اس قسم کی علّیت کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔



مطبوعات طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے تحریکِ پاکستان کی دینی اساس سے متعلق
ذاتی مشیر، منفرد مفکرِ قرآن و بانی تحریک طلوعِ اسلام اور تحریکِ پاکستان گولڈ میڈلسٹ

علامہ غلام احمد پرویز کی تصنیفات 2021

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)		3000
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلد۔ دو جلدوں میں)		3500
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)	Out Of Print	
تبویب القرآن (مجلّد)		3000
مطالب الفرقان (مکمل سیٹ ـــــ سورہ فاتحہ تا سورہ الحجر)	3500	5000
مطالب الفرقان (جلد اول)	500	1000
مطالب الفرقان (جلد دوم)	500	1000
مطالب الفرقان (جلد سوم)	500	1000
مطالب الفرقان (جلد چہارم)	500	1000
مطالب الفرقان (جلد پنجم)	*	1000
مطالب الفرقان (جلد ششم)	500	*
مطالب الفرقان (جلد ہفتم)	Out Of Print	
من و یزداں (اللہ کا صحیح تصور)	500	*
اِبلیس و آدم	500	1000
جُوئے نور	500	*
برقِ طور (داستانِ حضرت موسیٰؑ)	500	1000
شعلۂ مستور (حضرت عیسیٰؑ کی داستان)	*	1000
معراجِ انسانیت (سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ)	600	1200

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	400	800
انسان نے کیا سوچا؟	500	1000
اِسلام کیا ہے؟	400	800
کتاب التقدیر	500	1000
جہانِ فردا (مرنے کے بعد کیا ہوگا؟)	*	1000
شاہکارِ رسالت (سیرتِ فاروقِ اعظمؓ)	600	1200
نظامِ ربوبیت (قرآن کا معاشی نظام)	500	1000
تصوف کی حقیقت	500	1000
قرآنی قوانین	400	800
سلیم کے نام خطوط (جلد اول)	400	800
سلیم کے نام خطوط (جلد دوم)	*	800
سلیم کے نام خطوط (جلد سوم)	*	800
طاہرہ کے نام خطوط	400	800
ختمِ نبوت اور تحریکِ ''احمدیت''	300	600
حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (قائدِ اعظمؒ)	*	300
اقبالؒ اور قرآن (اول۔ دوم)	500	1000
مجلس اقبالؒ۔ اول (شرح مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی)	500	1000
مجلس اقبالؒ۔ دوم (شرح مثنوی پس چہ باید کرد...)	Out Of Print	
قائدِ اعظمؒ کے تصور کا پاکستان (مجموعۂ مقالات و خطبات)	400	*
بہارِ نو (مجموعۂ مقالات و خطبات)	400	800

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
ISLAM: A Challenge to Religion	500	1000
Exposition of the Holy Quran	*	3000
The Book Of Destiny	500	1000
Reasons for Decline of Muslims	*	500
Islamic Way of Living	250	500
Letters to Tahira	*	800
Quranic Laws	*	800
The Quranic System of Sustenance	*	800
Did Quaid-e-Azam Want to Make Pakistan a Secular State?	*	300
اسلامی معاشرت (روزمرہ کے متعلق قرآنی احکام وہدایات)	250	500
اسبابِ زوالِ امت	200	400
جہاد (جہاد کے متعلق قرآنِ کریم کے احکامات)	*	300
خدا اور سرمایہ دار (مجموعہ مقالات وخطبات)	300	600
سلسبیل (مجموعہ مقالات وخطبات)	400	800

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
فردوسِ گم گشتہ (مجموعہ مقالات وخطبات)	400	*

متفرق کتب

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مقامِ حدیث	400	800
قرآنی فیصلے (جلد اول)	500	*
قرآنی فیصلے (جلد دوم)	500	1000
قتلِ مرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	*	300
مزاج شناسِ رسول	300	600
تحریکِ پاکستان کے گم گشتہ حقائق	Out Of Print	
The Best Of A.S.K. Joommal	*	800
The Pakistan Idea	*	400
Woman - Recreated	*	400
The Bible - Word of God or Word of Man	*	500
The Holy Quran and our Daily Life	*	500

کتابیں ملنے کا پتہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
25 بی، گلبرگ 2، لاہور
فون نمبر: 35753666
trust@toluislam.com
www.toluislam.com

کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 01720041073503، حبیب بینک لمیٹڈ، مین مارکیٹ گلبرگ برانچ، لاہور۔

ان قیمتوں میں ڈاک خرچ اور پیکنگ کا خرچہ شامل نہیں۔ یہ قیمتیں کسی بھی وقت تبدیل ہوسکتی ہیں۔

Surah Al-Najm (النجم)
Durus-al-Qur'an: Chapter 3

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

My dear friends, today is October 5, 1982 and our lecture starts with Surah Al-Najm (النجم) verse (53:1).

Summary of the last two lectures

My dear friends, I presented details of the tradition that is called Isra and Mi'raj. For the first part, verse (17:1) is presented in support of our Prophet's journey on Buraq from Masjid Al-Haram to Masjid Al-Aqsa. And Surah Al-Najm is presented in support of the second part of the event – going to the heavens and meeting Allah. We saw that the first part is against the facts; and the second part is against the concept of Allah as presented by the Quran, which says that Allah is there wherever you are; that He is closer to you than your jugular vein. So, one does not have to go to a particular place to meet Him.

Anyway, let's start Surah Al-Najm. In a nutshell this Surah explains the proper position of نبی (Nabi)and its high status. It provides the true place of Muhammad (PBUH) as the recipient of Allah's وحی (Wa'hi - Revelation). Although the entire Quran is unique in its style and presentation, but some Surahs reach the pinnacle in their loftiness and elegance. And Surah Al-Najm is on top of the list of such Surahs, in my opinion.

Human mind cannotcomprehend the source of وحی (Wa'hi - Revelation)

My dear friends, although every word of the Quran is Quran; that every word of the Quran has within it deep meaning – but its source is beyond the material universe; that we cannot come up with a term for it, or even comprehend or imagine its source. This part of how the revelation originated and how it came down to the Prophet (PBUH) is beyond human grasp. But, nonetheless, its language and its meaning is connected with this world. So, we can very well imagine how deeply concentrated its meaning would be. This Surah reflects that characteristic. And its next part – which also consists of one or two words and is also deeply concentrated in its meaning – is to establish the divine

system in the world based on this revelation. So, we can say that the first part which involves the receiving of the revelation is نبوت (*Nabuwwat*); and the second part, to establish a system of life in the human world based on the revelation, is the رسالت (*Risaalat*). Although every prophet received a book, but our Prophet (PBUH) was at the pinnacle of نبوت (*Nabuwwat*) because he was the recipient of the final Book of Allah. That is why I titled my book on the biography of the Prophet (PBUH) as the "Pinnacle of Humanity."And that is why I titled abooklet, the "High Status of Muhammad (PBUH)" dealing with explanation of Surah Al-Najm.This Surah has the basic characteristics of both the نبوت (*Nabuwwat*) and theرسالت (*Risaalat*).

Quranprovides fundamental attributesoftrue knowledge

A movement called "humanism" started in Europe but couldn't get very far. Its signs are still there though. The idea behind this movement was that humans need religion but that religion should not be based on revelation from God. Julian Huxley was a prominent figure in this movement and the title of his book is "Religion without Revelation." He claimed that he was in search of such a manmade religion, and he wanted that this should be presented in such a language which "would be simple enough to appeal to the generality of men, but at the same time deep and rich enough to satisfy the most complex mind" (NY Times, 8.22.1952). The Quran has both these qualities. There were very few among Arabs who could read and write 1400 years ago. They were the most backward people in the world at the time. These were the first addressees of the Quran. To present the realities of the Quran so that even they could understand, was a challenging and difficult task. The Quran is a guidance for humanity until eternity. So, no matter how far human knowledge advances, the Quran will continue to lead that knowledge, and will continue to guide humankind. So, think about it my friends: how unique, unparalleled, and all-encompassing attributes this Book should have! This is the style of the Quran. Now, look how the Quran explains these nomadic desert Bedouins that this Book will serve them as their guidance – that it will not change; that it will not deceive; thatit will not desert them in the middle of the way.

Arabs generally travelled in the night because of the extreme desert heat in the day.There were no roads nor lightsnor landmarks nor towns in the desert. Oases were few and far between where nomadic Bedouins used to stay for few days and move on to the next one.Imagine it is dark night. Sand dunes in deserts will be here today and gone tomorrow. So, they cannot serve as landmarks. Bushes could not serve as landmarks because

the desert storms would cover them with sands. These were the conditions under which these Bedouins used to travel in the night. So,they were asked: what provided you guidance to travel in the night under these harsh and uncertain conditions? The answer: Stars. Did the stars deceive you ever? No. Did any star which was at one place one night and suddenly disappeared the other night? No. So, these heavenly stars provide you complete and permanent guidance in your journey at night and do not deceive you? Yes, that is the case. Then, don't you think you also need heavenly, complete, and permanent guidance that will guide you in your life's journey as well? This is a perfect and clear cut way to explain to these illiterate Bedouin Arabs about the divine guidance that will guide them in their life journey as well – that will never deceive them; nor disappear nor change.

So, this is what the first verse of Surah Al-Najm says: مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ;وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ(53:1-2) – These people wonder about to what extent Allah's وحی (Wa'hi -Revelation), which claims to guide them, is dependable? They are afraid that at some time it may either mislead them or leave them in the lurch. Ask them: where did they get their guidance from, when they travel at night in the desert, where they do not have any fixed sign or clear path to guide them. There you determine your course after seeing the position of stars. So what does this experience tell you? Is that guidance not dependable? Do the stars deceive you by changing their positions? Do they not always provide you the same guidance? Have they ever left you confused? So whatever opinion you have with regard to the stars, it should be exactly the same in respect of Allah's وحی (Wa'hi -Revelation). The Messenger gets theوحی (Wa'hi - Revelation) from the same source from where stars get their guidance to travel on a set course (6:98; 56:75). Therefore, the star which appears at a fixed point and which travels across a set course and sets at a particular point (always following the same course and pattern), is a witness to the fact that,your companion (who has been commanded to guide you on the right path of life) is neither wandering in search of the right course, nor has he gone astray after finding it. He knows his destination and the way that leads to it.

As we have mentioned many times before the letter وis used in Arabic for evidence, and Najm means star. The word هَوَىٰ is a very comprehensive word. It includes in its meaning all its three phases: its rise at a certain place; its complete path that it travels through; and then a fixed place that it sets.

Quran's introduction of the Prophet (PBUH)

Arabs were extremely proud of their poetry and their language. They used to call others 'Ajam (dumb). But they were awe-struck by the presentation and the style of the Quran. They didn't know what to call it – poetry, prose, or something else. The verse (53:1) has just two words. The word هَوَىٰ captures the rise, the entire movement, and the setting of star. And the Quran introduces the Prophet (PBUH) to them as their صاحب (Sahib), as their companion and friend – not their Imam or leader. The Quran tells them: the Prophet (PBUH) to you is like the members of your caravan. غَوَىٰ means one who haslost one's way; and ضَلَّ means one who is trying to find one's way. So, the Quran is saying that your companion has not lost his way. He knows his way and his destination, just as the star does. Both get their guidance from the same source. The person who receives revelation clearly knows his way because it is not the result of his own effort and thoughts. If one has to find one's own way, then one goes through a trail-and-error process. But a messenger receives revelation from Allah. There is no trace in it of his own thoughts. What the messenger conveys to you is purely objective truth that comes from the Almighty creator of the Universe, Allah. So, the Quran proclaims: وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (53:3) – Whatever he tells you in his capacity as a Messenger, he does not say it on his own. He only narrates the وحی (Wa'hi - Revelation) revealed to him from the Almighty. The Quran contains Divine revelation and the feelings or personal opinion of the Messengerhave no share in it. Human emotions and opinions are a result of personality and reflect a person's exposure in society. However, the وحی (Wa'hi - Revelation) that one gets from outside source is objective truth. It is permanent, unchangeable, and impervious to human emotions and thoughts.

Human intellect makes decision based on the material and data it has at certain time. After a while when dataor material change, it makes a different decision. In fact, human thoughts keep changing all the time. So, what the Messenger presents to you is not the product of his own thoughts. It is Allah's revelation: إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ(53:4) – Whatever he tells you in his capacity as a Messenger, he does not say it on his own. He only narrates the وحی (Wa'hi - Revelation) revealed to him from the Almighty. Quran contains Divine revelation and the feelings or personal opinion of the Messenger have no share in it.

The Quran says thatوحی (Wa'hi - Revelation)was sent to stars, to heavens and earth, to honeybee. So, the وحی (Wa'hi - Revelation) sent to the Messenger will definitely guide you to the final divine goal as promised.

The Messenger will practically implement the divine plan and the results will provide the proof. So: قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (6:135) – O Messenger, tell your people: "You may do whatever you choose; I will not interfere. On the other hand, do not interfere in My program. The results will soon show to whom success will eventually belong. Allah's law is that tyrants can never prosper."

This is the pragmatic test for any program: you work on your program and I will work on my program. The result will show who is beneficial to humanity. End of the matter! But this is not the case in the world of religion. Just keep following what you are told by the religious leaders. When people ask them why the promised results are not showing up, people are told that results will come in the hereafter. That is, take the medicine here but you will get better after you die! However, this is Deen which provide pragmatic test *here* in *this* world. It says to its opponents to provide proof: قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (2:111) – Provide the proof if you are truthful.

My dear friends, this is distinctive characteristic of Deen compared to religion. This is how the Quran explained the divine guidance to the illiterate Bedouins by pragmatic example of stars who used them for their guidance for traveling in the desert at night. Now, let us see how the Quran could also provide guidance to scientist and intellectuals. The Quran says that all things in the Universe are tightly interconnected and are subject to the Laws of Nature; and that humans have been given the power to conquer the forces of nature and make use of them. Objects in the Universe are so tightly interconnected with each other that James Jean says that if I move my figure then it has effect on stars inside the galaxies. So, on one side, the illiterate desert Bedouins were able to understand and, on the side, scientists like James Jean is also able to understand from the same statement that the Quran presents. This is the reason Maurice Buccaille was in awe when explaining such verses of the Quran related to Nature and asked all the scientists of the world to ponder on this fact: that how could a human being tell these things 1400 years ago when modern science has been able to discover only now! So, the author of the Book, the Quran, must be the author of the book of Universe.

My dear friends, the claims of the Quran are not based on creed. We, Muslims, have not done our job to understand the Quran from this point of view, what to say of providing irrefutable evidence of Quran's claim to the world. Therefore, from the stars the Quran provides practical

evidence of its message to Bedouins as well as to top scientists. So, what the Messenger presents to you is not the product of his own thoughts. It is Allah's revelation: إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (53:4). I presented many verses in previous lectures about this. There is no need to repeat here. Here are some references regarding how stars guide you (6:97, 56:75, 81:15). Next the Quran says regarding the revelation that the Prophet (PBUH) receives: عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ(53:5) – He gets it from One, Who is Universally Mighty and Powerful. You can visualize His Power and might from the countless stars and galaxies that are traveling in their determinedpaths, bound by His Laws. Similarly, the laws that have been revealed to humankind through this وحی (Wa'hi - Revelation) are bound to produce their results, without any deviation.

The fundamental differences in thinking and in program between Deen and religion

My dear friends, please ponder what a great reality the Quran has described in (53:5). Sermons exhorting morality and ethics have continued in the world. Every religion preaches these things. Deen does not preach and sermonize. Deen establishes its system in the world. It confronts the forces of falsehood head on. It fights and overpowers them. Therefore, to establish Deen power is needed. This was the fight between religion and Deen that we went through during Pakistan movement. Proponents of religion were saying that there is no need to have a separate country for Islam; that we are free to practice Islam by remaining in India. So, why demand a separate country? Yes, ok, for religion there is no need to have a separate state. But to establish Deen requires not only a separate state but also power to maintain control of the state. After receiving the teaching (عَلَّمَهُ) of revelation, strong power (شَدِيدُ الْقُوَىٰ) is required to establish it. As Allama Iqbal says: If there is no power, then divine rule cannot be established – the work of Moses becomes worthless.

System of sustenance must adapt to changing conditions

Nothing remains the same forever. Everything in nature changes continuously. Bedouin Arabs didn't travel the same path always. They travelled to different destinations depending on changing conditions. The condition and requirements of humankind keeps changing all the time at the individual level as well as at the collective level. A child's nutritional requirement keeps changing from the moment he is born. Nourishment progressively adapts as the fetus develops inside the mother's womb. After birth the mother's milk automatically adjusts to nutritional requirement of the baby as he grows. This is the system of

divine sustenance. This attribute of Allah is called Rahim – One who provides nourishment that adapts progressively according to changing conditions.

Character attributes required to implement Allah's system of sustenance

My dear friends, if you look at the entire life of an individual from birth to death then you will notice that requirement for his physical, mental, and psychological sustenance and development keep changing throughout his life.An individual's life goes through many phases through this life. Allah does not give this sustenance all at once. He does not say that take this sustenance, which is for your entire life. If He has all the power and authority, if he is شَدِيدُ الْقُوَىٰthen He has also the control over different phases humans go through throughout life: ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ(53:6) – Not only does the Almighty possess unlimited powers, but He is also aware of the various ups and downs of life. He is therefore capable of providing comprehensive guidance that covers all aspects of one's individual and collective life. It is obvious that the person, the Messenger, who has to receive وحی (Wa'hi - Revelation) should be an embodiment of virtue and wisdom. Hence the Messenger's personality developed with complete poise and his character attained perfect purity to accomplish the task of establishing the universal system of sustenance.

As I mentioned, there is a world of meaning in every word of the Quran. One who has only power knows only power. But. along with having power and authority,He also has the responsibility of providing sustenance. So, He must also know and have full control over the requirement of providing sustenance in every phase and every period of life. This is the case with the One who provides the وحی (Wa'hi - Revelation). Then comes the responsibility of the recipient of the وحی (Wa'hi - Revelation), the Prophet (PBUH). After receiving the revelation, he must have the power to establish the universal divine system of sustenance; and to practically provide and carry out that responsibility of messenger-hood through all the phases of life of the community.

(ب) انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکناتِ زندگی مضمر یا خوابیدہ شکل میں ہوتی ہیں۔ان کو مشہود یا بارآور (Actualise) کرنا ہوتا ہے۔

(ج) صفات خداوندی کے جذبات سے بلند، منزا اور مبرا ہونے کے بالمقابل، انسانی صفات میں جذبات کا دخل ہوتا ہے۔شہودِ صفات سے پہلے جذبات پر پورا پورا کنٹرول کرنا لازمی امر ہوتا ہے۔

5- انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے کہ ان صفاتِ خداوندی کو معیار بناتے ہوئے ہر ممکن استعداد سے انہیں اپنے اندر منعکس کیا جائے۔جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہوا اس کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگا جاتا ہے۔اس طرح وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا ہے اور خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں بہرحال خدا رفیق اعلیٰ ہوتا ہے۔

6- صفاتِ خداوندی کی انسانی ذات میں نمود سے جوں جوں اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، یہ اس کے ایمان اور سیرت میں مزید پختگی کا باعث بنتی ہے۔اس طرح وہ ارتقائی مراحل سے گذرتے ہوئے حیات بعد الممات کا امیدوار بننے کے قابل ہو جاتا ہے تاکہ اس مقام کے حصول کے بعد وہ مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت حاصل کر سکے۔

7- صفاتِ خداوندی متعدد اور متنوع ہونے کے علاوہ بعض مقامات پر، باہم گر متضاد بھی ہیں۔مثلاً وہ رحیم و کریم بھی ہے اور جبار و قہار بھی۔ذات (کیریکٹر) کے معنی یہ ہیں کہ جس جگہ جس قسم کی صفت کی نمود ضروری ہو وہاں اس صفت کا ظہور ہو اور حسنیٰ کے تحت اس قدر ظہور ہو جس قدر اس موقع پر اس کی ضرورت ہو۔اگر غفور و رحیم کی صفات کے اطلاق ہونے کے مواقع پر قہاریت و جباریت کی صفات کا ظہور ہو جائے تو اس سے نظامِ عالم میں اصلاح کی بجائے فساد برپا ہو سکتا ہے۔

8- انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ایسی شے نہیں جس کے متعلق دوسرے کو کچھ علم ہی نہ ہو سکے۔ان صفات کا اظہار، انسان کی سیرت و کردار میں ہوتا ہے، جو مرئی اور محسوس شکل میں ہر ایک کے سامنے آ جاتا ہے۔اسی کو انسان کا کیریکٹر کہتے ہیں۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.74
ISSUE
2

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

بیادِ غلام احمد پرویز

عبدالعزیز خالد

ہو گیا رخصت بساط تنگنائے دہر سے
اک خدا آگاہ، روشن فکر مردِ خود گرے

دانش و بینش کا پیکر، پُر بہار و خوش صفات
کلک و قرطاس و لبِ اظہار جس کی کائنات

اک ادارہ، ایک تحریک، اک مشن تھی جس کی ذات
شمع رکھی جس نے روشن فکرِ قرآنی کی تاحینِ حیات

طعنے گمراہی کے سنتا، وار بدنامی کے جو سہتا رہا
بات اپنے دل کی بیباکی سے لیکن برملا کہتا رہا

مہر خاموشی لگی خوفِ فسادِ خلق سے
جس کے ہونٹوں پر نہ پل بھر کے لئے

(کیوں نہ ہو جدت پسندی کو اِبا تقلید سے
کیا دماغ نکتہ پرور کور مغزوں سے ڈرے؟)

جہل فتوے جس کے کفر و قتل کے دیتا رہا
کشتیِ عمرِ رواں جو بحرِ ہیبت ناک میں کھیتا رہا

قرضِ مرگِ ناگہاں سے روز جو نقدِ نفس لیتا رہا

زندگی بھر تنگ ظرفی سے کیا جس نے نباہ
اک زمانہ جس کے عزم و استقامت کا گواہ

بے گناہی کے سوا کیا تھا بھلا اس کا گناہ؟
تھی بقولِ محرماں اس کو نہ حرصِ مال و جاہ

باوجود بے نوائی بے محابا، بے پناہ
کچھ نہ رکھتا تھا وہ اقبالی قلندر

جُز دو حرفِ لاالٰہ

کوہکنؔ کی جس میں پامردی، یہ وہ پرویز تھا
اور اسی باعث تھی شیرینؔ خرد اس پر فدا

صاحبِ فرہنگ، اندیشہ سگالے، عاقلے
کہتے تھے جس کے عقیدت مند ''بابا جی'' اُسے

وہ وفاداریٔ بشرطِ استواری کی مثال
عمر بھر کی بے قراری کا ثمر جس کا کمال

تھے بہم جس میں مذاقِ منطق و ذوقِ جمال
آگہی کی اِک فروزاں شمع تھی جو بجھ گئی

آہ بیدردی تری! اے زندگی! اے زندگی!